تعلیم و تربیت

اکتوبر 2012ء

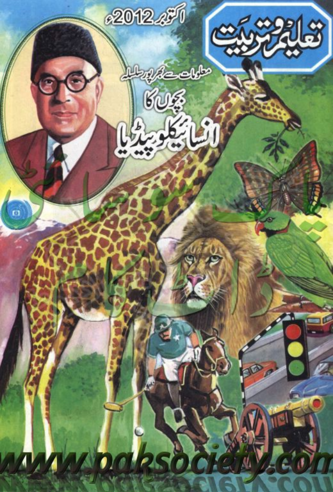

معلومات سے بھرپور سلسلہ

بچوں کا
انسائیکلوپیڈیا

www.paksociety.com

بچوں کا محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

اکتوبر 2012ء

72 واں سال چھٹا شمارہ | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

سعد جب بھی اپنے گھر آتا، گھر کی حالت دیکھ کر اداس ہو جاتا تھا۔ ایک تنگ سی گلی میں اُن کا ایک چھوٹا سا پرانا گھر تھا۔ جس دن وہ اپنے دوست حمزہ کے نئے گھر جاتا تو اُس کی اداسی مزید بڑھ جاتی تھی۔ ایک دن امی جان نے اُسے اپنے پاس بلا کر کہا: ''آؤ، میں تمھیں شیخ سعدی شیرازی کی شاہ کار کتاب ''گلستانِ سعدی'' سے ایک حکایت سناتی ہوں، یہ حکایت صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی تروتازہ ہے اور انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے، سعدی لکھتے ہیں کہ میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ بن کر رہا ہوں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مصیبت کے وقت میری زبان پر حرفِ شکایت آیا ہو، ایک بار ایسا ہوا کہ میرا جوتا ٹوٹ گیا اور نیا جوتا خریدنے کے لیے میرے پاس پیسے نہ تھے۔ ننگے پاؤں ہونے کے باعث میں بہت اداس تھا، اس سے قبل کہ میری زبان پر ناشکری اور شکایت کے کلمات آتے میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو دونوں پاؤں سے محروم تھا۔ اُسے دیکھ کر بے اختیار میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ یہ بے چارہ تو دونوں پاؤں سے محروم ہے جب کہ میرے پاؤں تو سلامت ہیں۔ تم اُن لوگوں کی طرف دیکھو جن کے پاس اپنے گھر نہیں ہیں، وہ کرائے کے گھروں میں رہنے پر مجبور ہیں جیسا بھی ہے، ہمارا گھر تو اپنا ہے۔'' امی جان کی بات سعد کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے عزم کیا کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنے گھر کی حالت بدلے گا۔ یاد رکھیے جو لوگ اپنے سے برتر کو دیکھتے ہیں وہ فکر میں مبتلا رہتے ہیں اور جو اپنے سے کم تر کو دیکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ آئیے اللہ کے شکرگزار بندے بن کر اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی خوش نودی حاصل کریں۔

شہیدِ ملت لیاقت علی خان قائداعظمؒ کے دستِ راست اور بااعتماد ساتھی تھے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی پاکستان کے قیام و استحکام کے لیے وقف کیے رکھی۔ 16 اکتوبر 1951ء کو آپ راول پنڈی میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کر رہے تھے کہ اکبر نامی ایک شخص نے آپ کو گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ پاکستان کے لیے آپ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

اس ماہ کے آخر میں عیدالاضحیٰ منائی جائے گی۔ ہماری طرف سے عید کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبدالسلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سعید لخت	محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
حمد	کرامت بخاری	2
درسِ قرآن و حدیث	محمد طیب الیاس	3
سلامتی کا راستہ	علی اکمل تصور	4
نیم پلیٹ	علی حسن	8
کھوج لگائیے	ننھے کھوجی	12
شیطانی چہرہ	ڈاکٹر عمران مشتاق	13
اوجھل خاکے	ادارہ	16
آئیے عہد کریں	عروج فاطمہ	18
مددگار	رابعہ ثناء	19
پیارے اللہ کے...	راشد علی نواب شاہی	22
ٹک ٹک کتاک	مجیب ظفر انوار حمیدی	25
بچوں کا انسائیکلوپیڈیا	ڈاکٹر طارق ریاض خان	29
عید قرباں	ضیاء الحسن ضیا	32
ہم دیا	محمد طارق سرا	33
میری زندگی کے مقاصد	پُرعزم قارئین	37
سنہرے لوگ	غلام حسین میمن	40
کھیل اور کھلاڑی	نسرین شاہین	43
داد دی علمی آزمائش	ذہین قارئین	46
آپ بھی لکھیے	ہونہار ادیب	47
فرزانہ	کاشف ضیائی	51
آپ کا خط ملا	ننھے قارئین	55
انوکھی دنیا	اظفر حسنین	57
دشمن کی کہانی	نذیر انبالوی	60
ہونہار مصور	ننھے مصور	64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: بچوں کا انسائیکلوپیڈیا

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہِ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور
042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

WWW.PAKSOCIETY.COM

حمد

وہ خالق وہ مالک وہ سب سے بڑا
وہ سب سے الگ ہے، وہ سب سے جُدا

خدا سے فقط لو لگائے رہو
اُسی در پہ سر کو جھکائے رہو

کرو زندگانی میں اچھے عمل
تو ہو جائیں گی مشکلیں ساری حل

کتابِ الٰہی کو چھوڑو نہیں
ہدایت سے منہ اپنا موڑو نہیں

محبت کرو اور محنت کرو
بہادر بنو اور خدا سے ڈرو

جو دُنیا کے دھوکے میں آ جائے گا
وہ دھوکے پہ دھوکہ ہی کھا جائے گا

کرامت بخاری

WWW.PAKSOCIETY.COM

محمد طیب الیاس

درسِ قرآن وحدیث

قربانی

قربانی کا عبادت کے طور پر ادا کرنا اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ثابت ہے، لیکن اس کی ایک خاص شان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواب میں حکم ہوا کہ اپنے اکلوتے فرزند کو ہماری راہ میں قربان کرو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہونہار فرزند کو یہ حکم سُنایا تو سعادت مند بیٹے کا جواب یہ تھا:

"اے اباجان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے آپ اس کو پورا کیجئے ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔"

(الصافات: ۱۰۲)

پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل کرنے لگے، بیٹے کو پہلو کے بل لٹا دیا اور گلے پر چھری رکھی تو چھری نے چلنے سے انکار کر دیا، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی: "اے ابراہیم! تم نے خواب سچا کر دکھایا۔" (الصافات: ۱۰۵)

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ایک مینڈھا بھیج دیا جو ان کی جگہ قربان کیا گیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! قربانی کی حقیقت کیا ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔" صحابہ کرام نے عرض کیا: "ہمارے لیے اس میں کیا ثواب ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جانور کے ہر بال کے عوض ایک نیکی نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔ (مسند احمد)

پیارے بچو!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے قربانی دینی چاہیے، دکھاوے کے لیے جانور قربان کرنے سے قربانی کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جانور قربان کرنے والے کو اس جانور کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی دی جاتی ہے، دنبے اور بھیڑ کے بدن پر کتنے لاتعداد بال ہوتے ہیں اگر آپ صبح سے لے کر شام تک بھی ان بالوں کو شمار کرنا چاہیں تو شمار نہیں کر سکتے، تو گویا ایک جانور قربان کرنے سے لاکھوں نیکیاں مل گئیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم مدینہ طیبہ میں اپنی قربانیوں کو خوب موٹا کرتے تھے اور سب مسلمانوں کی یہی عادت تھی۔ (بخاری شریف)

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قربانی کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کا کوئی عمل قربانی کا خون بہانے سے زیادہ پسندیدہ نہیں اور قیامت کے دن قربانی کرنے والا اپنے جانور کے بالوں، سینگوں اور کھروں کو لے کر آئے گا (اور یہ چیزیں ثواب عظیم ملنے کا ذریعہ بنیں گی) نیز فرمایا کے قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف قبولیت حاصل کر لیتا ہے لہٰذا تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کرو۔" (ترمذی)

ماہِ ذی الحجہ کی ۱۰، ۱۱، ۱۲ تاریخ ...... یہ تین دن قربانی کے ہیں اور ان میں پہلے دن قربانی دینا افضل ہے، اور قربانی کے ان تین دنوں میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب عمل یہی ہے کہ جانور کو اس کی رضا کے لیے ذبح کیا جائے، قربانی کے خون کا قطرہ زمین پر بعد میں گرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ پہلے ہی شرف قبولیت پا لیتا ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

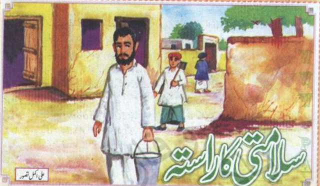

سلامتی کا راستہ

علی اکمل تصور

خواب اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔ خواب دیکھنے والا اپنی ادھوری خواہشات کو پورا ہوتے دیکھتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک لمبی جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ صبر اور برداشت کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا راستہ ہوتا ہے اور قاری عبدالرحمان اس راستے پر چل رہا تھا۔ اُس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اب وہ خواب حقیقت بننے جا رہا تھا۔

وہ ایک پس ماندہ گاؤں کا رہائشی تھا۔ یہاں سہولت کی اور ضرورت کی کوئی چیز دستیاب نہیں تھی۔ لوگ غریب تھے۔ بجلی تو تھی لیکن گاؤں کے سب سے بڑے زمین دار کے ہاں...... یا پھر گاؤں کی اکلوتی مسجد میں...... پانی کے حصول کے لیے ایک کنواں موجود تھا، لیکن وہ گاؤں سے باہر تھا۔ گاؤں کے لوگ بڑی مشکل سے پانی بھر کر اپنے اپنے گھروں میں لاتے تھے۔ گاؤں کے لوگ زمین دار کے کھیتوں میں کام کرتے تھے یا پھر شہر جا کر مزدوری کرتے تھے۔ ان مزدوری کرنے والوں میں قاری عبدالرحمان کا باپ بھی شامل تھا۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اب اُس کی عمر آرام کرنے کی تھی، لیکن کام کرنا اُس کی مجبوری تھی۔ وہ شہر میں زیورات کی ایک دکان پر بطور پہرہ دار کے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ مالک مہربان تھا۔ اُس نے عبداللہ کو ایک کمرہ رہنے کے لیے دے رکھا تھا۔

عبداللہ ہفتے میں ایک بار اپنے بیوی بچوں سے ملنے گاؤں آتا تھا۔ اور چھٹی کا دن گزار کر واپس لوٹ جاتا تھا۔ قاری عبدالرحمٰن، عبداللہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور سب سے لاڈلا تھا۔ عبداللہ نے بڑی مشکل سے اُسے میٹرک تک تعلیم دلائی تھی۔ پھر اُس کی سکت ختم ہو گئی تھی۔ آگے اپنے مستقبل کا فیصلہ قاری عبدالرحمان نے خود کیا تھا۔ اب وہ حفظِ قرآن اور قرات کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ گاؤں کے قریب ایک قصبے میں اُس کا مدرسہ تھا۔ اس فیصلے کا پہلا انعام اُسے یہ ملا تھا کہ گاؤں کے تمام لوگ اُسے قاری صاحب کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ ابھی اُس کی سترہ سال عمر تھی۔ اتنی عمر میں اتنی عزت دیکھ کر عبداللہ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔ اور عبدالرحمان کی سوچ بس اس نقطے پر آ کر ٹھہر جاتی تھی کہ اُسے اپنی اس عزت کو برقرار رکھنا ہے۔ اور ایک دانے سے سو دانوں کی بالی تک کا سفر خوش اسلوبی سے طے کرنا ہے۔

خواب سے تعبیر تک کا یہ سفر قاری اور اُس کے ابو نے اٹھارہ ماہ میں طے کیا تھا۔ اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے انہوں نے ماہانہ پانچ سو روپے کی ادائیگی کی بنیاد پر کمیٹی ڈالی تھی۔ اور اب اٹھارہ ماہ بعد انہیں بیس ہزار کی رقم ملی تھی۔ اس رقم سے قاری کا خواب پورا ہو سکتا تھا۔ قاری کے گھر والوں کے لیے یہ ایک بڑی رقم تھی۔ گھر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمام افراد اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ امی اس رقم سے اپنی بیٹی کا جہیز بنانا چاہ رہی تھی۔ دونوں بڑے بھائی کاروبار کرنا چاہ رہے تھے۔ اس رقم کو دیکھ کر گھر کے تمام افراد کی ادھوری خواہشات کروٹ بدل کر جاگ اٹھی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُن کی خواہشات رقم دیکھ کر جاگی تھیں۔ جب کہ قاری نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے صبر اور برداشت سے کام لے کر اپنے ابو کی مدد سے رقم اکٹھی کی تھی۔ اُس کے ابو نے اُس کی مدد کیوں کی تھی؟ تو اس کی ایک وجہ تھی۔ اور وہ وجہ یہ تھی کہ قاری کی خواہش انفرادی نہیں تھی۔ باقی لوگ اپنی اپنی ذات کی حد تک سوچتے تھے۔ جب کہ قاری سب کے لیے سوچتا تھا۔ اور قاری کے ابو کو اس کی سوچ کا یہ انداز سب سے زیادہ پسند تھا۔

قاری عبدالرحمان مسافر بس میں بیٹھا اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ وہ سفر تھا جو اُس کی زندگی میں سکون بھرے لمحات لا سکتا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے باہر مناظر تیزی سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ اور کچھ مناظر ایسے تھے جو قاری کی آنکھوں میں آنسو بن کر تیر رہے تھے۔ کچھ یادیں جو کل تک اُسے تکلیف دیتی تھیں۔ آج اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بن گئی تھیں۔ کوئی آپ کے ساتھ بُرا سلوک کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ اُس سے انتقام لیں یا پھر اس بات کا انتظار کریں کہ اللہ کی طرف سے وہ کسی تکلیف یا مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ ایک اچھا انتقام یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ وہ مقام حاصل کر لیں جو اُس کے پاس ہے۔ اور آج قاری وہ مقام حاصل کرنے نکلا تھا۔ اُس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک خالی بالٹی ہاتھ میں پکڑے گھر سے نکل رہا تھا کہ امی نے اُسے آواز دی تھی۔

''بیٹا! پانی لینے کے لیے کنویں کے پاس مت جانا۔ تم چھوٹے ہو اور کنواں بہت گہرا ہے......''

''تو پھر امی میں کہاں جاؤں؟'' قاری کے لہجے میں معصومیت تھی۔

''بیٹا! زمین دار کے ہاں چلے جانا یا پھر مسجد میں چلے جانا، تم چھوٹے ہو، تمہیں پانی ضرور مل جائے گا۔''

''جی امی!'' قاری اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ یہ بات سچ تھی کہ قاری کو کنویں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ گھر کے پانی بھرنے کی ذمہ داریاں قاری کی تھی۔ ابو تو گھر پر ہوتے نہیں تھے۔ اور اُس کے دونوں بڑے بھائی کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ ابو نہیں چاہتے تھے کہ گھر کی عورتیں باہر جائیں۔ اس لیے پانی بھرنے کا کام قاری نے اپنے کمزور کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ اُس کی امی اُسے روزانہ کنویں پر نہ جانے کی تاکید کرتی تھیں۔ اور اپنے خوف کے باوجود قاری روزانہ کنویں پر جاتا تھا۔ کیوں کہ زمین دار نے اُسے اپنے ہاں سے پانی بھرنے سے روک دیا تھا۔ اور امام مسجد کا کہنا تھا کہ مسجد میں موجود پانی نمازیوں کے وضو کے لیے ہے۔ اس لیے مجبوراً قاری کو پانی کنویں پر سے ہی بھرنا پڑتا تھا۔ یہ ایک بہت تکلیف دہ عمل تھا۔ کنویں کی منڈیر پر قاری یوں کھڑا ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اُس کی کمر پر رسی باندھ کر پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو۔ وہ مرتا کیا نہ کرتا کی کیفیت میں پانی سے بھرے مشکیزے کی رسی اُوپر کی طرف کھینچتا اور پھر اپنی بالٹی سے پانی بھر کر گھر کی طرف دوڑ لگا دیتا۔ ایسی تقریباً دس بالٹیوں کی ضرورت اُس کے گھر میں ہوتی تھی۔ ایسے حالات میں قاری نے ایک خواب دیکھا۔ اُس کے گھر کے صحن میں پانی نکالنے والا ایک دستی نلکا نصب تھا۔ اور وہ اُس کی ہتھی کو حرکت دیتے ہوئے پانی نکال رہا تھا۔ قاری کے ابو قاری کی مصیبت سے آگاہ تھے۔ اور پھر جب قاری نے اپنے ابو کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو ابو فوراً مان گئے تھے۔ یوں آج اٹھارہ ماہ بعد قاری اپنے ابو کی مدد سے اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ اپنی منزل کو حاصل کر لے۔ اب اُسے زمین دار کا وہ دھکا یاد آ رہا تھا جو پانی کے اصرار پر اُس نے قاری کو دیا تھا۔

''بھاگ جاؤ یہاں سے...... اگر آج تم پانی لے گئے تو گاؤں کے تمام لوگ میری حویلی کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں گے......'' اُسے وہ عورت یاد آ گئی تھی۔ جو کنویں پر پانی بھرتے ہوئے چکرانے کے باعث کنویں میں ہی گر گئی تھی۔ اور پھر بڑی مشکل سے اُس کی جان بچائی گئی تھی۔ جب کنویں پر لوگوں کا ہجوم

WWW.PAKSOCIETY.COM

زیادہ ہوتا تھا تو گاؤں والے چھوٹا سمجھ کر اُس کی باری ہی نہیں آنے دیتے تھے۔

وہ جتنا زیادہ سوچ رہا تھا۔ اتنا ہی زیادہ الجھتا جا رہا تھا۔ اُس کی سوچ کا انداز بدلنے لگا تھا۔ اُسے تو سب سے ہی انتقام لینا تھا۔ کتنا مزہ آئے گا جب اُس کے گھر دستی نلکا لگ جائے گا۔ اور پھر وہ اپنے گھر پر ہی اپنی ضرورت کے مطابق پانی بھر لیا کرے گا۔ بلکہ پانی بھرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب دل چاہا جب ضرورت محسوس ہوئی پانی نکال لیا۔ اور گاؤں کے لوگ......؟ انہیں تو میرے گھر سے ایک قطرہ بھی پانی کا نہیں ملے گا۔ کوئی تھا جو قاری کے وجود میں چھپ کر اس سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ بس میں سفر کرتے قاری کو ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ پھر بس رُک گئی۔ وہ شہر آ پہنچا تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں قاری نے اپنی خریداری مکمل کر لی تھی۔ اور اُسے نلکے کا بور کرنے کے لیے کاری گر بھی مل گئے تھے پھر گاؤں واپس آ کر سفر شروع ہوا۔ نلکا لگانے کا ساز و سامان دیکھ کر پورے گاؤں میں شور مچ گیا تھا۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ جو یہ سامان دیکھنے آ رہا تھا۔ سب حسرت کی نظر سے قاری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے نزدیک قاری گاؤں کا وہ پہلا غریب لیکن خوش قسمت آدمی ہو گا۔ جس کے گھر میں پانی کا چشمہ پھوٹے گا۔ قاری اب ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کاری گروں کو اشارہ کیا۔ زمین کے سینے پر پہلی ضرب قاری نے لگائی تھی۔ پھر کھدائی کا کام شروع ہو گیا۔ قاری کسی مزدور کی مانند کھدائی کے کام میں حصہ لے رہا تھا۔ اُس کا جوش دیکھنے کے قابل تھا۔ ہجوم اب چھٹ چکا تھا اور کام جاری تھا۔ پھر رات ہو گئی۔ وہ رات کاری گروں نے گاؤں میں گزاری۔ قاری کے بھائیوں کا مزاج کچھ اچھا نہیں تھا۔ شاید انہیں اس بات کا غم تھا کہ اس رقم سے وہ فائدہ نہیں اٹھا پائے تھے۔

پھر اگلے دن کا آغاز ہوا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی کام کا آغاز ہو گیا۔ قاری شام ہونے سے پہلے کام مکمل کروانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ پورا ہفتہ شہر میں گزارنے کے بعد چھٹی والے دن سے ایک دن پہلے شام کو اُس کے ابو گھر لوٹے تھے۔ اور آج اُسے اپنے ابو کو دستی نلکے کا تحفہ دینا تھا۔ آج اس نلکے کے ٹھنڈے میٹھے پانی سے ابو کی پیاس بجھانی تھی۔ کاری گر دل لگا کر کام کر رہے تھے۔ اور پھر دوپہر کے ٹھیک دو بجے دستی نلکے سے پانی کی دھار بہہ نکلی۔ قاری کے دل کی خوشی کا عالم بس وہی جانتا تھا۔ اُس نے اللہ کی بارگاہ میں سر سجدے کے لیے جھکا لیا۔

سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا۔ جب ایک مسافر بس

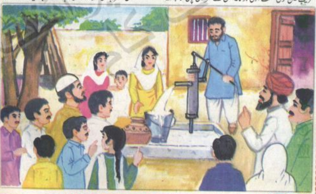

WWW.PAKSOCIETY.COM

گاؤں کی طرف جانے والے راستے کے سامنے آ کر رُکی تو قاری کے ابو بس سے نیچے اُتر آئے۔ اور گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑے۔ جلد ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ آج گاؤں میں کوئی انہونی ہوئی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ میرے گھر میں نلکا لگنے والی بات تو اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر ماجرا کیا ہے۔ کیا ہوا ہے۔ لوگوں کے تیور کیوں بدلے ہوئے ہیں۔ پہلے تو لوگ اُن کے ساتھ ایسے پیش نہیں آتے تھے۔ آج کیا ہو گیا ہے کہ لوگوں نے اُن کے گرد گھیرا بنا لیا ہے۔ کیا یہ لوگ اُن کے گھر سے پانی بھرنے کی فرمائش کریں گے۔ ایسے میں انہیں ایک بات یاد آئی۔

"لوگوں کی ضرورتوں کا تمہارے ساتھ وابستہ ہونا تم پر اللہ کی عنایت ہے......" پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لاڈلے نواسے حضرت امام حسین کا یہ قول ہے۔ عبداللہ زیرِ لب مسکرایا اور اُس نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اُس کے گھر آنے والے کسی ضرورت مند کو وہ پانی بھرنے سے نہیں روکے گا۔

چلتے چلتے عبداللہ گاؤں کے چوراہے پر پہنچ گیا۔ یہاں پیپل کے درخت کے نیچے ایک عجیب منظر تھا۔ لوگوں کا ایک ہجوم دائرہ بنائے کھڑا تھا۔

"یااللہ خیر...... یہاں کیا ہوا ہے۔" عبداللہ پریشان ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ عبداللہ ہجوم کی طرف بڑھتا۔ کوئی زور سے چیخا۔

"وہ دیکھو...... قاری صاحب کے ابو......" عبداللہ نے دیکھا سارا ہجوم اب ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"یااللہ خیر......" پہلے تو عبداللہ گھبرا گیا۔ پھر چونک پڑا۔ پھر کانپ کر رہ گیا۔ تمام لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اب عبداللہ کے لیے رکنا مشکل تھا۔ وہ ہجوم میں سے راستہ بناتے اور پھر پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ کر اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جو منظر اُس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اُس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ اور پھر جانے وہ کون سا احساس تھا کہ عبداللہ کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔

پیپل کے درخت کے نیچے پانی نکالنے والا دستی نلکا نصب تھا۔ قاری نے دستی نلکا اپنے گھر پر نصب کروانے کی بجائے گاؤں کے چوراہے پر نصب کروا دیا تھا۔ تاکہ گاؤں کے تمام لوگ اس سے سیراب ہوں۔ اس سے اچھا انتقام اور بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ لوگ عبداللہ کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ قاری کو دُعائیں دے رہے تھے۔ اُس ایک لمحے میں عبداللہ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ آج اُس کے بیٹے نے اس راستے پر پہلا قدم رکھا تھا۔ جو راستہ ایک دانے سے سو دانے کی بالی تک کو جاتا تھا۔ آج اُسے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر یہ کہنا تھا کہ شاباش میرے بچے تم اُس راستے پر چلے ہو جو اللہ کے برگزیدہ بندوں کا راستہ ہے اور یہی راستہ سلامتی کا راستہ ہے کیوں کہ "میں" کا راستہ تو شیطان کا راستہ ہے۔ ☆☆☆

"بلاعنوان" کے یہ عنوانات بھی اچھے تھے

☆ بندر ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے۔ (حسن رضا سردار، کاموکی)

☆ اکیسویں صدی کا بندر۔ (ثمرہ اعجاز، فیصل آباد)

☆ ون ویلنگ کے رنگ، بندر کے سنگ۔ (فاطمہ علوی، فیصل آباد)

☆ بندر نے بائیک چلائی، ون ویلنگ کر کے سب کو دکھائی۔ (سید دانیال قمر، بہاول پور)

☆ یہ بندر ہے نئے زمانے کا۔ (محمد ابوذر غفاری، فیصل آباد)

☆ خطروں کا کھلاڑی۔ (معتز طارق، راول پنڈی)

☆ لگتا ہے بندر کو شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ (محمد محسن علی قادری، کاموکی)

☆ انسانوں کی طرح بندر بھی ون ویلنگ کر سکتے ہیں۔ (عبید صدیقی، میاں والی)

☆ ون ویلنگ کرنا سیکھنی ہے تو میرے پاس آؤ۔ (راحت اقبال، کراچی)

☆ ماڈرن بندر۔ (نور فاطمہ، لاہور)

☆ میں ہوں ون ویلنگ ماسٹر۔ (حماد علی شاہ، لالہ موسیٰ)

☆ یہ منظر دیکھا ہے پہلی بار، موٹر سائیکل پر بندر سوار۔ (محمد شہروز، علی)

☆ بندر میاں! ذرا سنبھل کر۔ (ناز فاطمہ، کراچی)

☆ لو جی، بندر بھی ون ویلر ہو گئے۔ (محمد حسین احسن، فیصل آباد)

☆ باکمال بندر، لاجواب ون ویلنگ۔ (خلیل الرحمٰن، شرق پور شریف)

☆ بندر چلا انسان کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا۔ (محمد ذیشان شیرازی، ملتان)

☆ ارے بھیا! بندر کسی سے کم نہیں۔ (اجمل افضل، لاہور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

نیم پلیٹ

علی حسن

مجھے مشکل میں پھنسے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ پورے ہفتہ میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جو میں نے سکون سے گزارا ہو۔ نہ کھانے پینے میں پہلے جیسا مزہ آ رہا تھا اور نہ پڑھنے پڑھانے میں۔ میں خود اس مشکل میں پھنسا تھا۔ میں نے دُوسری منزل پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی سے گلی میں جھانکا تو گلی میں ہُو کا سا عالم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی دیو نے پھونک مار کر گلی کے مکینوں کو خاموش کر دیا ہو۔ نہ گلی میں بچے کھیلتے دکھائی دے رہے تھے اور نہ سالن کی پلیٹیں ہاتھوں میں لیے ننھی منی بچیاں ایک گھر سے دُوسرے گھر میں داخل ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔

''یہ خاموشی میری وجہ سے ہوئی ہے...... میں ہی وہ دیو ہوں جس نے ہنستے بستے گھروں میں خاموشی کو بٹھا دیا ہے...... یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے...... میں ہی قصور وار ہوں......'' میں نے خود کلامی کی۔

ہمارا محلّہ جس کی ایک دیوار پر امن اسٹریٹ کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا، واقعی امن کا محلّہ تھا۔ ہر طرف امن و سکون تھا۔ ایسا لگتا تھا یہ محلّہ نہ ہو ایک گھر ہو۔ محلے کے مکین طویل عرصے سے یہیں آباد تھے۔ غم ہو یا خوشی ہر موقع پر مل بیٹھنا روایت بن گئی تھی۔ دُوسرے محلے کے لوگ رشک بھری نظروں سے ہمارے محلے کو دیکھتے تھے۔

ایک سال قبل کی بات ہے۔ دُوسری رو میں رہنے والے یونس صاحب ایک حادثے میں شدید زخمی ہوئے تو محلے بھر کے لوگ بے چین ہو گئے تھے۔ ہسپتال میں ایمرجنسی وارڈ کے باہر ایسا لگا تھا کہ امن اسٹریٹ یہیں آباد ہو گئی ہو۔ ہر کوئی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ جب ڈاکٹر نے خون طلب کیا تو ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ اس کا خون لیا جائے۔ کئی بچے بھی اپنے ابو کے ساتھ ہسپتال آ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے جب پوچھا کہ تم سب کون ہو تو سبھی نے جواب دیا تھا، یونس کے بھائی ہیں۔ یونس صاحب شدید زخمی ہوئے تھے، مگر محلے کے مکینوں کی محبت نے انہیں جلد صحت یاب کر دیا۔ جب وہ ہسپتال سے گھر منتقل ہوئے تو سب نے ان کی خوب خدمت کی۔ کوئی اپنے گھر سے پھل لا رہا ہوتا تو کوئی ہاتھ میں ٹھنڈا دودھ لیے ان کے پاس آتا۔ یونس صاحب جب صحت یاب ہوئے تو اسحاق صاحب نے چکن پلاؤ کی ایک دیگ غریبوں میں تقسیم کی تھی۔

میرے بھیا ظہیر نے بتایا تھا کہ جب گلی میں پہلا ٹیلی ویژن آیا تھا تو سبھی محلے والے قمر صاحب کے ہاں ڈرامہ دیکھنے کے لیے جاتے تھے۔ برآمدے میں دائیں طرف بڑی میز پر ٹیلی ویژن لگا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیا جاتا تھا اور دری پر ناظرین بیٹھ جاتے تھے۔ اِدھر ڈرامہ چلتا اُدھر چائے کا دور چلتا رہا۔ یہ بات تو میرے سامنے کی ہے جب غلام رسول صاحب نے امن سٹریٹ میں رہنے والوں کو بتایا تھا کہ ان کے ہاں ٹیلی فون لگنے والا ہے۔

''باؤ غلام رسول! ایسا ہو جائے تو بہت سہولت ہو جائے گی......'' رفیع نے کہا۔

''میں نے فیس جمع کرا دی ہے ان شاء اللہ اب جلد فون لگ جائے گا......'' غلام رسول بولا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے...... خالد بیٹا سعودی عرب سے خط کے بجائے فون ہی کیا کرے گا...... غلام رسول کیا فون آنے پر بلا لیا کرو گے؟'' ریاض کی بات سن کر غلام رسول نے فوراً کہا۔

''بھائی ریاض! ضرور بلا لیا کروں گا...... یہ فون میرے گھر میں نہیں امن اسٹریٹ میں لگ رہا ہے...... یہ سب کا سانجھا ٹیلی فون ہو گا۔''

غلام رسول نے اپنی بات واقعی سچ کر دکھائی تھی۔ ان کے ہاں دن بھر محلے والوں کے فون آتے تھے۔ غلام رسول کی بیوی اور بچے خوشی خوشی متعلقہ گھر کو فون آنے کی اطلاع پہنچاتے تھے۔ کئی بار تو ایسا ہوتا کہ رات گئے بہت سے لوگوں کے فون آتے تھے، مگر غلام رسول اور اس کے گھر والوں نے کبھی ماتھے پر بل نہ ڈالا تھا۔

ریاض صاحب کا بیٹا جب پہلی بار سعودی عرب جانے والا تھا تو سارا محلہ اداس تھا۔ ایاز ایک ایک کو تسلی دے رہا تھا۔ خالہ کلثوم نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا! اپنا خیال رکھنا۔''

''خالہ جی میں اپنا خیال رکھوں گا...... بس آپ روئیں مت، میرے لیے دُعا کریں......''

محلے کے سبھی مرد ایاز کو الوداع کہنے ائیر پورٹ گئے تھے۔ ایاز جب رخصت ہونے لگا تو محلے والوں کی زبان پر دُعائیں اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایاز کا جب بھی سعودی عرب سے خط آتا ریاض سب کے سامنے اُسے پڑھتا۔ محلے کے ایک ایک فرد کے بارے میں پوچھا جاتا تھا اور تمام محلے والوں کے لیے خلوص بھر سلام ہوتا تھا۔

ہر گھر میں ہر روز دستر خوان پر ایک پلیٹ میں کڑھی ضرور دکھائی دیتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہمارے محلے کی ایک خصوصی چیز تھی۔ بیس گھروں میں جب بھی کسی کے ہاں کڑھی پکائی جاتی تھی وہ سب گھروں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ رمضان المبارک میں سب ایک دُوسرے کی افطاری کرواتے۔ عید کے موقع پر عید کارڈز، چوڑیاں، مہندی اور جیولری تحفتاً دیے جاتے۔ عید قربان پر بھی مل کر بکرے قربان کرتے واقعی اس دن عید کا حقیقی سماں ہوتا۔ میں اپنے سکول میں جب یہ ساری باتیں بتاتا تو میرے دوست اس پر یقین نہ کرتے تھے۔ عمران اکثر کہتا۔

''ہمارے محلے میں تو کوئی ایک دُوسرے کا نام بھی نہیں جانتا...... سب اپنے اپنے گھروں تک محدود ہیں...... تم جیسا بتاتے ہو ایسا یا تو کہانیوں میں ہوتا ہے یا پھر ڈراموں میں...... بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اس دور میں ایسا محلہ موجود ہے......''

ایک دن میں اسے یقین دلانے کے لیے امن اسٹریٹ لے آیا تھا۔ محلے کا ماحول دیکھ کر اور لوگوں سے مل کر اسے یقین ہو گیا تھا۔ جب وہ جانے لگا تو بے اختیار بولا:

''تمہارا محلہ واقعی محبت کا گہوارہ اور امن کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ یہاں اسی طرح محبت اور امن رکھے۔''

''یہ امن میری وجہ سے خراب ہو گیا ہے...... میری ایک معمولی سی حرکت کی وجہ سے امن اسٹریٹ میں امن نہیں رہا......'' میں بڑبڑایا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ راہ چلتے میرے ہاتھ کی ہلکی سی حرکت نے امن اسٹریٹ کے امن پر پینٹ کر دیا تھا۔ ''پینٹ'' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ نہ قمر صاحب کی نیم پلیٹ پر کالا پینٹ ہوتا اور نہ امن اسٹریٹ کا امن خراب ہوتا۔ آپ پوچھیں گے کہ قمر صاحب کی نیم پلیٹ کا محلے کے امن سے کیا تعلق ہے میں کہوں گا کہ بڑا گہرا تعلق ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ پچھلے ہفتے میں سکول ٹور پر ہڑپہ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ میں جب گھر لوٹا تو قمر صاحب کے سامنے والے گھر والوں نے پینٹ کا ایک خالی ڈبہ باہر پھینکا ہوا تھا۔ ڈبے میں ایک ٹوٹا ہوا برش بھی پڑا تھا۔ اس لمحے نہ جانے مجھے کیا ہوا میں نے برش جس پر پینٹ لگا ہوا تھا قمر صاحب کے گھر پر لگی نیم پلیٹ پر پھیر دیا۔ نیم پلیٹ بدنما ہو چکی تھی۔ میں نے برش گھما کر ایک طرف پھینک دیا۔ یہ حرکت کر کے میں خاموشی سے گھر میں داخل

WWW.PAKSOCIETY.COM

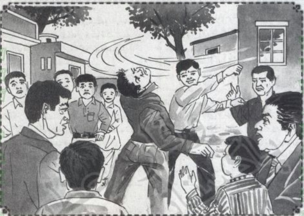

ہو گیا۔ صبح جب قمر صاحب نے نیم پلیٹ کو دیکھا تو ان کی توجہ کامران کی طرف گئی کیوں کہ پچھلے کئی دنوں سے وہ مسلسل شرارتیں کر رہا تھا۔ کبھی کسی کی بیل بجا کر بھاگ جاتا اور کبھی دروازے پر زور سے دستک دے کر غائب ہو جاتا۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ اُس نے کچھ بچوں سے ٹافیاں چھین لیں تھیں، بس یہی باتیں تھیں جس سے قمر صاحب نے اپنے طور پر طے کر لیا تھا کہ یہ شرارت بھی کامران کی ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ لطیف صاحب کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ چند ساعتوں بعد کامران ان کے سامنے تھا۔

''جی انکل......''

''نیم پلیٹ پر پینٹ کیوں لگایا ہے......'' یہ کہتے ہوئے قمر صاحب نے کامران کا کان زور سے مروڑا۔

''انکل میں نے ایسا نہیں کیا......'' قمر صاحب نے کان پر برابر دباؤ رکھا۔

''یہ حرکت تمہارے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا......''

''میں نے یہ حرکت نہیں کی۔'' کامران نے روتے ہوئے کہا۔

قمر صاحب نے اُس کا کان چھوڑا تو وہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے رو رو کر اپنے گھر والوں اور محلے والوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ کامران کا بڑا بھائی شہزاد باہر نکلا تو کامران نے روتے ہوئے بتایا کہ انکل نے اُسے مارا ہے۔ اگلے ہی لمحے قمر صاحب کا گریبان شہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ محلے والوں نے مداخلت کی مگر شہزاد باز نہ آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی شدت اختیار کر گئی۔ قمر صاحب کے بیٹے بھی آن دھمکے۔ جس کے ہاتھ میں جو آیا اس نے اسی سے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔ گالیوں اور اینٹوں کا کھلم کھلا استعمال ہوا۔ امن اسٹریٹ میں ایسی صورت حال پہلے کبھی پیش نہ آئی تھی۔ قمر صاحب کا سر پھٹ گیا اور شہزاد کی ٹانگ پر چوٹ آئی تھی۔ بات پولیس تک جا پہنچی۔ میں ایک طرف کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس لمحے کو کوس رہا تھا جب میں نے نیم پلیٹ پر پینٹ کیا تھا۔ امن اسٹریٹ میں اس لڑائی کے بعد دو گروپ بن گئے تھے۔ ایک گروپ شہزاد اور دُوسرا گروپ قمر صاحب کے ساتھ تھا۔ گلی کی نکڑ اور محمود کریانہ کی دُکان پر لوگ مختلف تبصروں میں مصروف تھے۔ جمیل نے قمر صاحب کی طرف داری کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کامران جیسا شرارتی لڑکا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

چند دنوں قبل وہ مسجد کے ساتھ والی گلی میں ایک دیوار پر یہاں کے بچے چور ہیں، لکھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔"

"کیا تم وہاں موجود تھے......؟" خالد نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے صرف سنا ہے......"

"سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے......" اسرار بھی بول پڑا۔

"کچھ ہوتا ہے تو بات نکلتی ہے، قمر صاحب کی نیم پلیٹ کو بھی اُس نے ہی خراب کیا ہوگا......" جمیل بولا۔

"قمر بھی تو نرا کنجوس ہے...... ایک چھوٹی سی نیم پلیٹ پر خرچ ہی کیا آتا ہے خواہ مخواہ محلے کا امن برباد کر دیا۔ اب تھانے میں کچھ دے دلا کر ہی جان کی خلاصی ہوگی۔"

غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ لڑائی کے دو دن بعد تک فریقین کا تھانے میں آنا جانا لگا رہا۔ تھانے میں اس لڑائی کا خاتمہ صلح پر ہوا۔ لیکن یہ صلح صرف تھانے تک ہی محدود رہی۔ صلح کے باوجود امن اسٹریٹ میں پہلے جیسی فضا قائم نہ ہو سکی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اب یہ خاموشی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر صدیوں جیسا بھاری گزر رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میں اپنے جرم کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔

"آخر میں کس کو بتاؤں...... کس طرح اپنا جی ہلکا کروں......"

اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے استاد کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تو یوں محسوس ہوا جیسے سہارا مل گیا ہو۔ شام کے وقت میں نے بغیر تمہید کے اپنے جرم کی تفصیل اپنے استاد کے سامنے بیان کی تو انہوں نے کہا۔

"غلطی کرنے کے بعد تمہارا بے چین ہونا تمہارے اچھے ہونے کی علامت ہے۔ پہلے تو سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور پھر......"

"اور پھر کیا......؟" میں نے فوراً پوچھا۔

استاد جی نے میرے سوال کا جواب تو میں نے کہا۔

"میں آپ کی بات پر عمل کروں گا...... میں امن اسٹریٹ میں امن واپس لاؤں گا۔"

"جاؤ بیٹا اللہ تمہاری مدد کرے......"

اپنے استاد کی دعائیں لیتا ہوا میں اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا۔ اگلے دن میں نے اپنے استاد کی بتائی ہوئی بات پر عمل کرتے

پاکستان میں مصوری کے شعبے میں نمایاں مقام
کے حامل نامور مصور محمود حسن رومی کہتے ہیں

ڈرائنگ

ہماری مالی حالت بہتر سے بہتر کر سکتی ہے۔

ہوئے مطلوبہ اشیاء کو جمع کیا۔ اب مجھے رات کا انتظار تھا تاکہ میں حاصل کردہ اشیاء کا استعمال کر سکوں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ پل بھر میں رات کا اندھیرا چہار سو پھیل جائے۔ خدا خدا کر کے رات نے اپنی آمد کی خبر دی۔ بارہ بجے کے قریب میں خاموشی سے بیرونی دروازہ کھول کر گلی میں آیا تو اچانک بجلی چلی گئی۔ چندا ماموں بھی آخری تاریخوں کی وجہ سے چھٹی پر تھے اس لیے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ جب میں بائیں طرف کھڑے درخت کے پاس پہنچا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کامران کے ہاں سے کوئی چپکے سے نکلا ہو۔ میں فوراً درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحوں بعد بجلی نے اسحاق صاحب کے گھر کے باہر لگے بلب کو روشن کیا تو میں نے دیکھا کہ شہزاد، قمر صاحب کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے شہزاد نے ایک کاغذ میں چھپائی چھوٹی سی تختی کو نکالا۔ اب اُس نے زمین پر پنجوں کے بل بیٹھ کر صمد بانڈ تختی پر لگائی اور اگلے ہی لمحے اُسے قمر صاحب کے دروازے پر لگا دیا۔ یہ منظر مجھے حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔ میرے ہاتھ میں بھی ایسی ہی تختی تھی جس پر میں نے قمر صاحب کا نام پینٹر سے خوب صورت انداز میں لکھوایا تھا۔ میرے نیم پلیٹ لگانے سے پہلے ہی شہزاد یہ کام کر چکا تھا۔ نیم پلیٹ کو لگا کر شہزاد جس خاموشی کے ساتھ اپنے گھر سے نکلا تھا اُسی خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ صبح جب میں نے قمر صاحب کو نیم پلیٹ لگانے والے کے بارے میں بتایا تو پہلے پہل تو انہوں نے یقین نہ کیا، مگر جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے خود شہزاد کو نیم پلیٹ لگاتے ہوئے دیکھا ہے تو قمر صاحب نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر شہزاد کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ پھر میری آنکھوں نے دیکھا کہ قمر صاحب شہزاد کو گلے لگا چکے تھے۔ اُسی وقت امن نے بلند آواز میں کہا۔ "میں آ گیا ہوں...... میں آ گیا ہوں...... اب امن اسٹریٹ دوبارہ امن اسٹریٹ بن جائے گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

دانیال کے ابو جان لاہور سے واپس آئے تو اُس کے لیے ایک خوب صورت گھڑی لے کر آئے تھے۔ دانیال گھڑی دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ ابو جان نے اُس سے کہا کہ یہ گھڑی تب اُسے ملے گی جب وہ ایک سوال کا جواب دے گا۔ دانیال نے پوچھا کہ سوال کیا ہے تو ابو جان بولے: "میں نے یہ گھڑی لاہور کے اُس معروف بازار سے خریدی ہے جس کے شروع میں ایک پھل کا نام آتا ہے، تم اب بازار کا نام بتاؤ۔" سوال سن کر دانیال نے کچھ سوچا اور پھر اُس بازار کا نام بتا دیا جس سے ابو جان نے گھڑی خریدی تھی۔ آپ نے کھوج لگانا ہے کہ دانیال نے بازار کا کیا نام بتایا تھا۔

ستمبر 2012ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح حل: یاسر کے کپڑے اور جوتے گیلے نہیں تھے اس لیے امی جان کو پتہ چل گیا کہ یاسر جھوٹ بول رہا ہے۔

1۔ وردہ طیب، جوہر آباد۔
2۔ افراح اکبر، لاہور۔
3۔ حمزہ امام ڈار، ڈسکہ
4۔ مقدس تاج، راول پنڈی۔
5۔ معاذ اکبر، فیصل آباد

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اکتوبر 2012ء ہے۔

کھوج لگائیے!

نام: ____________

پتا: ____________

WWW.PAKSOCIETY.COM

شیطانی چرخہ

ڈاکٹر عمران مشتاق

پہلے ایک ہلکا سا قہقہہ گونجا، پھر دھم کی آواز آئی جیسے کوئی گرا ہو اور ایک تیز چیخ کی گونج نے ابا جان کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ فوراً اپنی والدہ کے کمرے کی جانب لپکے۔ اُن کے خیال میں آواز وہیں سے آئی تھی۔ اُن کا خیال صحیح تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اُن کی والدہ اپنی جاء نماز پہ گری ہوئی ہیں اور اُن سے کچھ فاصلے پر مُنہ پر ہاتھ رکھے اُن کا بیٹا ندیم کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوف، وحشت اور فکرمندی کے سبھی رنگ جیسے ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ دادی اماں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ چیخ کی آواز یقیناً اُس کی تھی اور دادی جان ہی گری تھیں۔ وہ فوراً اپنی والدہ کی جانب بڑھے۔ وہ بے ہوش تھیں۔ انھوں نے دیکھا کہ اُن کی پیشانی پسینے سے تر تھی اور ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ندیم سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ والدہ کو جاء نماز سے احتیاط سے اُٹھا کر دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ اُنہیں اُٹھائے اُٹھائے اپنی گاڑی کی طرف بھاگے۔ اُن کا بنگلہ ایک ایسی نئی آبادی میں تھا جو شہر سے دُور تھی۔ اگر وہ ایمبولینس کے لیے فون کرتے تو کافی دیر ہو سکتی تھی بس یہ سوچ کر وہ اپنی والدہ کو اپنی گاڑی میں لے کر تیزی سے ہسپتال کی جانب روانہ ہوئے۔

ندیم کی امی اُن سے پوچھتی ہی رہ گئیں کہ کیا ہوا؟ مگر وہ جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکے تھے کہ واپس آ کر بتائیں گے۔"

ہسپتال میں اُنہیں فوراً ایمرجنسی طبی امداد دی گئی۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم فوراً اُن کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد اُنہیں بتایا گیا کہ اُن کی والدہ کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اُنہیں چند گھنٹے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھنے کے بعد دل کے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اب تمام قریبی رشتے دار ہسپتال پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ابھی کسی کو بھی اُن سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ سب اُن سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا تھا؟ وہ اگر خود جانتے ہوتے تو بتاتے۔ رات کو اُن کا چھوٹا بھائی ہسپتال میں رُک گیا تو وہ گھر واپس لوٹ آئے۔ ہسپتال میں مریض کے ساتھ صرف ایک تیمار دار ہی رُک سکتا تھا۔

اُنہیں شبہ تھا کہ کہیں اِس میں ندیم کا ہاتھ نہ ہو۔ وہ بے حد شرارتی تھا۔ وہ شرارتی ضرور تھا، مگر بدتمیز نہیں تھا۔ وہ عموماً چھوٹی موٹی شرارتیں ہی کرتا تھا۔ جیسے دادی اماں کا جاء نماز یا اُن کا چشمہ چھپا دیا۔ بڑی بہن کی چیزیں اُس سے پوچھے بغیر استعمال کر لیں اور پھر اُنہیں اِدھر اُدھر پھینک دینا کہ ضرورت کے وقت مل ہی نہ پائیں۔

گھر پہنچتے ہی اُنہوں نے ندیم کو بلوایا۔ ندیم کو دیکھ کر اُن کے دل کو کچھ ہوا۔ لگتا تھا کہ وہ کافی رویا ہے۔ وہ ابھی تھا بھی تو صرف دس سال کا۔ اُس کے لیے بھی یہ واقعہ حیرت اور تشویش کا باعث ہو گا۔

اُنہوں نے اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''بیٹے کیا ہوا تھا؟ دادی اماں کیسے گری تھیں؟''

''ابا جان! میں نے کچھ نہیں کیا؟ وہ تو خود ہی۔۔۔''

ندیم کی روئی روئی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

ابا جان ایک اُلجھن کے عالم میں اُسے دیکھنے لگے۔

''آخر ہوا کیا تھا؟''

''اماں آخر کیسے گریں؟''

''ندیم کیوں ہنسا تھا؟''

''وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟''

اُن کے ذہن میں کئی سوال اُٹھ رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس وقت ندیم شاید ہی کسی سوال کا ٹھیک جواب دے سکے۔

انہوں نے ندیم کی امی سے پوچھا۔''ندیم نے کچھ بتایا کہ اماں کیسے گریں؟''

''نہیں۔کچھ بھی نہیں بتاتا۔بس ایک ہی بات کی گردان لگا رکھی ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔''اُن کے جواب نے اُلجھن کو مزید بڑھا دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ندیم کا کوئی نہ کوئی تعلق اس معاملے سے ضرور ہے، مگر کیا؟''اِس سے آگے وہ نہ سوچ سکے۔

دادی اماں ایک ہفتے کے بعد گھر آئیں۔وہ بے حد کم زور ہو گئی تھیں۔اُسی شام امی نے دادی اماں کی صحت کے لیے دُعا اور قرآن خوانی کروائی۔خاندان بھر کے سبھی لوگ موجود تھے۔امی نے ایک یتیم خانے کو کپڑے اور کھانا بھجوایا تھا۔گھر کے سب لوگوں نے جب کھانا کھا لیا تو دادی اماں نے خاندان کی تمام خواتین اور لڑکیوں کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ندیم کے ابا جان اور دُوسرے حضرات بھی حیران تھے کہ دادی جان خواتین سے کیا ضروری بات کرنا چاہتی ہیں؟

تھوڑی دیر بعد دادی اماں نے ندیم کو اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہا۔وہ بے چارہ سہم سا گیا۔جب سے دادی جان ہسپتال گئی تھیں۔ اُس کی ساری شوخیاں اور شرارتیں ختم ہو گئی تھیں۔وہ سارا سارا دن اُداس اُداس سا پھرا کرتا۔ وہ ڈرتے ڈرتے دادی اماں کے کمرے میں گیا۔ وہاں اُس کی امی، چچی، پھپھو، بہن، چچا زاد اور پھوپھی زاد بہنیں اور خاندان کی کئی دُوسری خواتین بھی موجود تھیں۔ندیم وہاں سب کی موجودگی سے ہراساں ہو رہا تھا۔

''ڈرو نہیں۔تمہاری یہاں موجودگی ضروری تھی۔''دادی اماں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دادی اماں کے قریب پہنچا۔پھر اُن کا اشارہ پا کر اُن کے ساتھ ہی اُن کے بستر کی پٹی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو لڑکیو! آج میں تُم سے ایک خاص بات کرنا چاہتی ہوں۔ایک سوال،ایک بے حد اہم سوال۔''دادی اماں نے بات شروع کی تو سبھی اُن کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''جی اماں! کہیے ہم سب سُن رہے ہیں۔''ندیم کی اماں نے احترام سے کہا۔وہ اپنی ساس کی بے حد عزت کرتی تھیں اور دونوں کے بیچ انتہائی خوش گوار تعلقات تھے۔

دادی اماں کے سوال نے ایک لمحے کو تو سب کو حیران کر دیا۔ ندیم اب سب کو دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اِس سوال کا مقصد جانتا تھا۔ دادی اماں نے اُس کی طرف مُسکرا کر دیکھا تو اُس کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔

دادی اماں کو اپنا سوال پھر دہرانا پڑا۔وہاں موجود خواتین اور لڑکیوں نے اس بار فوراً جواب دیا۔ستر اسی فیصد خواتین کا جواب دادی اماں کے حسبِ منشا، تھا یعنی اُن کی توقع کے مطابق تھا۔

''ندیم وہ ویڈیو لے کر آؤ۔''اُنہوں نے ندیم کی طرف دیکھا تو وہ اُن کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ سبھی حیرت سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔سب کو پتہ تھا کہ وہ ٹی وی، سی ڈی اور ڈی وی ڈی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کتنے خلاف تھیں اور انہیں ”شیطانی چرخہ“ کہتی تھیں۔

ندیم نے منٹوں میں دادی اماں کے کمرے میں سارا انتظام کر کے ویڈیو لگا دی۔ یہ وہ ویڈیو تھی جو اُس نے خود ریکارڈ کی تھی۔ ویڈیو صرف چند منٹ کی تھی۔ دادی اماں کے کہنے پر اُس نے ایک منظر روک دیا۔ منظر دیکھنے کے بعد اب دادی اماں کا سوال سب سمجھ چکے تھے۔

دادی اماں کا سوال تھا۔ ”تم میں سے کتنے لوگ نماز بیٹھ کر پڑھتے ہیں؟“

دادی اماں کہنے لگیں: ”یہ ویڈیو تمہیں دکھانے کا مقصد صرف احساس پیدا کرنا تھا۔ یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اکثر خواتین اور لڑکیاں بیٹھ کر نماز پڑھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت ویسے تو بیٹھ کر بھی کی جا سکتی ہے اور کھڑے ہو کر بھی، مگر حکم یہ ہی ہے کہ نماز بغیر کسی عذر کے بیٹھ کر نہیں پڑھنی چاہیے۔“

”اماں! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں اکثر فرض تو کھڑے ہو کر پڑھتی ہوں اُس کے بعد سُنتیں اور نوافل بیٹھ کر ادا کرتی ہوں۔ بس ایک عادت سی ہو گئی ہے۔“ اُن کی چھوٹی بہو نے شرمندگی سے اپنی عادت کا اعتراف کیا۔

”بہو! یہ تم نے ٹھیک کہا۔ بُری عادتیں فوراً پختہ ہو جاتی ہیں جب کہ اچھی عادتوں کے لیے بڑا وقت لگتا ہے۔ شیطان جو ہر دم ہمارے پیچھے لگا رہتا ہے۔ اُس کی کوشش ہر لمحہ یہ ہی ہوتی ہے کہ ہمیں تن آسانی کی جانب مائل کرے کہ تن آسانی سب کو بھاتی ہے۔“ دادی اماں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم اکثر اپنے گھر میں اور آس پاس ہونے والی چیزوں کو دیکھ کر سیکھتے ہیں۔ اگر ایک لڑکی یہ دیکھتی ہے کہ اُس کی ماں، نانی یا دادی بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہے تو وہ یہ ہی سمجھتی ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں حتیٰ کہ یہ بات عادت بن کر ایسی پختہ ہو جاتی ہے کہ اسے کوشش کے باوجود چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔“

اُسی شام کا ذکر ہے کہ جب سب مہمان چلے گئے تو ندیم کے ابا جان اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکے اور اپنی اماں سے اُن کے کمرے میں ہونے والی کارروائی کے بارے میں جاننا چاہا۔ جواب میں اُنہیں بھی وہ ویڈیو دیکھنا پڑی۔ ویڈیو میں ایک معذور آدمی کو دکھایا گیا تھا جس کی ٹانگیں گھٹنوں کے جوڑ سے کٹی ہوئی تھیں اور وہ گھٹنوں کے جوڑ پہ کھڑا ہو کر نماز ادا کر رہا تھا۔ پاس ہی اُس کی مصنوعی ٹانگیں رکھی تھیں۔ نماز ادا کرنے میں اُسے یقیناً مُشکل کا سامنا تھا مگر وہ بڑی ہمت سے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا تھا۔

”ندیم نے اپنی طرف سے مجھ سے شرارت کی تھی کہ یہ ویڈیو ریکارڈ کر لی تھی اور مجھے دکھا کر یہ کہنے لگا کہ دادی جان آپ بیٹھ کر نماز پڑھتی ہیں اور یہ بے چارہ معذور شخص کیسے اپنی کم زوری پر قابو پا کر اللہ کی عبادت کر رہا ہے۔“ دادی اماں نے بڑے پیار سے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کیسے گری تھیں؟“ ابا جان کی زبان پر وہ سوال آ ہی گیا جو کئی دنوں سے اُن کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھا۔

”اس میں ندیم کا کوئی قصور نہیں۔“ دادی اماں سنجیدگی سے بتانے لگیں۔ ”ندیم کی ویڈیو دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی۔ میں بھی تو ایک عرصے سے بیٹھ کر نماز پڑھ رہی تھی۔ بس میں نے طے کر لیا کہ اب نماز ہمیشہ کھڑے ہو کر ہی ادا کروں گی۔ میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے اپنے بائیں پہلو میں ایک ہلکا سا درد ہوا اور میرے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ ندیم میری کوششوں پر شاید مُسکرا رہا تھا اور ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا کہ دادی اماں یہ آپ کے لیے مُشکل ہے، بس پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا؟“

”دراصل آپ یہ بھول گئی تھیں کہ کچھ عرصہ پہلے ہی آپ کے کولہے کی ہڈی کا آپریشن ہوا تھا اور ابھی آپ کو ڈاکٹر نے زیادہ دیر کھڑے ہونے سے منع کیا تھا۔ آپ کو دل کا مرض بھی ہے اور آپریشن (سرجری) کے بعد دل پر بوجھ پڑنے کی صورت میں دل کے دورے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔“ ندیم کے ابا جان نے وضاحت کی۔ اب ساری بات اُن کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہوا کیا تھا؟

”دادی اماں اب تو آپ ٹی وی کو ”شیطانی چرخہ“ نہیں کہیں گی ناں؟“ ندیم نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”نہیں میرے بیٹے، کوئی بھی چیز بُری نہیں ہوتی صرف اُس کا استعمال ہی اُسے اچھا یا بُرا بناتا ہے۔ اللہ کی بابرکت ذات نے تو تمام چیزیں انسان کے فائدے ہی کے لیے بنائی ہیں۔ یہ انسان ہی ہے کہ چیزوں کے منفی استعمال ڈھونڈ لیتا ہے۔“ دادی اماں نے یہ بات ایسے انداز میں کہی کہ سب ہی مُسکرانے لگے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

اوجھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

معلوماتِ عامہ

- ڈنیا کی پہلی مطبوعہ کتاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک پر لکھی گئی جو کہ چین کے ایک مبلغ نے ۶۱۸ء اور ۶۲۸ء کے درمیان لکڑی کے بلاکوں سے چھاپی تھی۔ اس وقت اُس کتاب کے صرف دو صفحے باقی ہیں۔
- قطب جنوبی میں سورج سبز دکھائی دیتا ہے۔
- ڈنیا میں سب سے لمبی سرنگ روس میں ہے، جو ۱۲ میل لمبی ہے۔
- اگر ہم چاند کی سطح پر کھڑے ہو کر زمین کی طرف دیکھنا چاہیں تو اس کے لیے ہمیں اُوپر کی طرف دیکھنا ہوگا۔

(محمد طلحہ، اٹک)

- ٹارزن کا کردار ای۔ وی۔ بیرنگ جرنی نے تخلیق کیا تھا۔
- فرانس ایک ایسا ملک ہے جس میں مچھر نہیں پایا جاتا۔
- ٹیپو سلطان برصغیر کا وہ حکمران تھا جس کے دربار میں شیر بندھے رہتے تھے۔
- سال کا سب سے بڑا دن ۲۲ جون جب کہ سب سے چھوٹا ۲۲ دسمبر ہے۔

(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

- ڈنیا کا سب سے بڑا آتش فشاں کیلی فورنیا کے پلوسٹون پارک میں واقع ہے۔
- چیونٹیاں ہمارے ماحول کو صاف رکھتی ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو مرے ہوئے کیڑے مکوڑے ہر طرف پڑے ہوئے ہوں۔
- ڈنیا کا سب سے بڑا اسکول شکاگو میں ہے۔
- ڈنیا کا سب سے بڑا ہسپتال بغداد میں ہے۔
- ڈنیا کا سب سے بڑا درخت انڈیا میں ہے۔
- ڈنیا کی سب سے بڑی مسجد ترکی میں ہے۔
- ڈنیا میں سب سے زیادہ بندر بھارت میں پائے جاتے ہیں۔

(شائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میاں والی)

- پاکستان کا سب سے بڑا چڑیا گھر لاہور میں ہے۔
- پاکستان کا سب سے بڑا جنگل چھانگا مانگا ہے۔
- ڈنیا کا سب سے بڑا تالا پاکستان کے شہر گوجرانوالہ میں ہے۔
- ڈنیا کا سب سے بڑا نہری نظام پاکستان کا ہے۔
- پاکستان کے قومی ترانے میں حرف الف ۴۶ مرتبہ آیا ہے۔
- پاکستان کے قومی ترانے میں ۱۴۰ نقطے ہیں۔

(صباء ناز، لاہور)

- پاکستان کا دل لاہور کو کہتے ہیں۔
- داتا کی نگری لاہور کو کہتے ہیں۔
- شہر لاہور دریائے راوی کے کنارے آباد ہے۔

(حافظ بشریٰ، گوجرانوالہ)

- قائداعظم نے جناح کیپ اور شیروانی پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں پہنی تھی۔
- لال بیگ کے خون کا رنگ سفید ہوتا ہے۔
- مگر مچھ کی زبان نہیں ہوتی۔
- ڈنیا کا سب سے بڑا جزیرہ گرین لینڈ ہے۔
- مینڈک کے دانت اور پسلیاں نہیں ہوتیں۔
- مرنے کے بعد انسان کا دماغ ۱۰ منٹ تک کام کرتا ہے۔

(شیین رابعہ، گوجرانوالہ)

- انڈونیشیا نے ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہالینڈ سے آزادی حاصل کی۔
- مالدیپ نے ۲۶ جولائی ۱۹۶۵ء کو برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔
- ملیریا کے باعث گلوکوز کی کمی سے ہر سال عالمی سطح پر ۱۰ لاکھ بچے مر جاتے ہیں۔
- ڈنیا کی بلند ترین عمارت "برج الخلیفہ" کا ۴ جنوری ۲۰۱۰ء کو دبئی میں افتتاح ہوا۔ اس کی بلندی ۸۲۸ میٹر ہے۔
- ڈنیا میں قدرتی گیس کے سب سے بڑے ذخائر روس کے پاس ہیں۔
- بنگلہ دیش جنوبی ایشیا کا سب سے پُرامن ملک ہے۔
- نیدرلینڈ کو ہالینڈ بھی کہا جاتا ہے۔

(محمد عارف نذیر، اوکاڑہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئیے عہد کریں

سر اکرم کے جماعت میں آنے میں تھوڑی دیر کیا ہوئی طلبہ نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کوئی طالب علم شور مچانے لگا اور کوئی کاپیوں سے صفحات پھاڑ کر ہوا میں اُڑانے لگا۔ جماعت میں اُس وقت کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عمر سب سے زیادہ گلا پھاڑ رہا تھا۔ سر اکرم جب جماعت میں آئے تو طلبہ انہیں دیکھ کر فوراً اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ اب جماعت میں مکمل خاموشی تھی۔ سر اکرم نے ایک نظر طلبہ پر ڈالی اور پھر کچھ سوچ کر بولے: ”مجھے آپ کا اس طرح شور مچانا اچھا نہیں لگا، اگر استاد کے جماعت میں آنے میں تھوڑی سی دیر ہو جائے تو طلبہ کو چاہیے کہ وہ خاموشی سے جماعت میں بیٹھیں، مجھے اُمید ہے آپ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔“ سر اکرم کی بات سن کر طلبہ نے عہد کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ آپ میں سے جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہدنامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔

شاباش

ان بچوں نے عہد کیا کہ وہ آئندہ کبھی نماز کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے اور نماز پابندی سے پڑھا کریں گے۔

آمنہ اکبر، بھیرہ۔ عائشہ خالد، راول پنڈی۔ فاطمہ مسعود، راول پنڈی۔ محمد حارث بھٹ، ملتان۔ عبدالرحمان ظفر، شیخوپورہ۔ محمد عبداللہ، کراچی۔ زنیرہ اسماعیل، گوجرانوالہ۔ ایوذر، بنوں۔ محمد عادل خان، واہ کینٹ۔ ایچ ایم سلیم ناز، اوکاڑہ۔ اسماء افضل، لاہور۔ عفان عثمان، شیخوپورہ۔ محمد مبشر، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سارہ طارق، فیصل آباد۔ محمد وحید، راول پنڈی۔ عبدالقدیر خان، نیو ملتان۔ مصباح شفقت، لاہور۔ محمد حذیفہ انوار، جھنگ صدر۔ کشف ارشد، گوجرانوالہ۔ حارث تنویر، لاہور۔ وردہ انور، میاں والی۔ عائشہ ادریس، علی پور۔ محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ۔ شہزاد حیدر، لاہور۔ تحریم اعجاز، فیصل آباد۔ عائشہ رضا، کراچی۔ محمد طارم نعیم، ساہی وال۔ کومل امجد، ملتان۔ سعد خالد ظفیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ عمیر خالد، راول پنڈی۔ حسان بدر، بورے والہ۔ ایمن رؤف، لاہور۔ عبیرہ فاطمہ، تلہ گنگ۔ محمد آصف، جہلم۔ کشف ارمغان، شیخوپورہ۔ حسن علی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ تحریم آرش، بہاول پور۔ شامیر اظہر، لالہ موسیٰ۔ خولہ ثاقب، لاہور۔ حریم زبیر، گوجر خان۔ اسامہ وارث، اوکاڑہ۔ معاذ احمد صدیقی، کندیاں۔ حمنہ اظہر، سرگودھا۔ عفان ثاقب، کراچی۔ ارتسام احمد، واہ کینٹ۔ حارث جمیل، لاہور۔ سعد اللہ، حویلی لکھا۔ بارعہ لاہور۔ محمد حذیفہ، دینہ۔ محمد معاذ اسد، آزاد کشمیر۔ محمد حذیفہ علی، ملتان۔ محمد واصف، ملتان۔ سدرہ ظفر بٹ، لالہ موسیٰ۔ ایمن کائنات، ڈیرہ غازی خان۔ ایمان فاطمہ، راول پنڈی۔ فرحان صدیق، لاہور۔ ردا گل، سرگودھا۔

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 اکتوبر 2012ء ہے۔

نام ________ مقام ________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ________

____

____

WWW.PAKSOCIETY.COM

مددگار

رابعہ ثناء

کمرے کا دروازہ کھلا اور تین لوگ اجازت لے کر میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے ہیڈ آفس سے اُن کی آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ میں نے سرسری سا اُن کے چہروں کی جانب دیکھا۔ وہ اپنا تعارف کروا رہے تھے۔ یہ لوگ اُس کمپنی کے سٹاف میں سے تھے جو حال ہی میں ہماری کمپنی میں ضم ہوئی تھی، یہ لوگ میرے ماتحت کے طور پر آج ہی چارج سنبھالنے کے لیے آئے تھے۔

دو افراد کا تعارف مکمل ہوا تو میں تیسرے کی جانب متوجہ ہوا اور میری نظر اُس کے چہرے پر ٹھہر سی گئی۔ میں اُسے پہچان چکا تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں پہچان کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ وہ مجھے پہچان بھی کیسے سکتا تھا......؟ وہ چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ لیے اپنے تعارف میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے صرف اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ نظر آ رہے تھے کیوں کہ ذہن تو میرا 24 مارچ 1999ء کے اُن لمحوں میں پہنچ چکا تھا جب میں اُس شخص سے پہلی بار ملا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری منزل پر واقع ایک مشہور کمپنی کا ہال اُمیدواروں سے بھر چکا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں سینئر اکاؤنٹنٹ کی اسامی کے لیے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں جب ہال میں پہنچا تو اتنے زیادہ اُمیدواروں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مایوس ہوا۔ پھر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل پر گرفت مضبوط کی...... یہ ہی میرا قیمتی اثاثہ تھا، میری تمام اسناد جن میں میری بہترین کارکردگی لفظوں میں بول رہی تھی۔ میں نے خود کو مضبوط کیا اور ایک کرسی پر ٹک گیا اور تمام ہال کا جائزہ لینے لگا۔ ہال میں ہر رنگ کے لوگ موجود تھے۔ پُراعتماد، بے نیاز، جھجکتے ہوئے چہرے، کہیں بولتی آنکھیں اور خاموش لب اور کہیں خاموش آنکھیں اور بولتے ہونٹ۔ میں ہر چہرے کو باری باری دیکھتا ہوا خود اپنی جانب متوجہ ہوا...... بدرنگ سرمئی شرٹ اور گھسی ہوئی جینز...... سادہ سے بند جوتے اور جما کر بنائے ہوئے بال۔ میں خود پر غور کر ہی رہا تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے نے مجھے مخاطب کیا۔

''کیوں بھائی صاحب! کہاں سے آئے ہیں؟'' وہ بہت مطمئن لگ رہا تھا۔

''میں...... مزنگ سے آیا ہوں۔'' میں نے اُس دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سے اُمیدوار انٹرویو کے لیے جا رہے تھے۔

''اچھا...... مزنگ سے۔'' وہ بولا۔

''سنو بھائی! دیکھ رہے ہو کتنے اُمیدوار ہیں......؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے......؟'' اچانک اُس نے میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔

''کیوں نہیں...... میرے پاس بہترین تعلیمی ریکارڈ ہے۔ کسی قدر تجربہ بھی موجود ہے، میری کامیابی کا کافی امکان ہے، مجھے اپنی قابلیت پر بہت بھروسہ ہے۔''

''تعلیمی ریکارڈ......، تجربہ......؟ بھائی کس دُنیا میں رہتے ہو۔ اس فائل کا آج کی قابلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل تو بس سفارشیں چلتی ہیں۔'' اُس نے میری فائل کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''تم وقت ضائع کر رہے ہو...... سلیکشن ہو چکی ہے...... انٹرویو

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو بس نام کا ہے......'' وہ میرے کان کے بہت قریب آ کر بولا تھا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا تو وہ ہنس دیا۔

''یقین نہیں آیا؟ کوئی بات نہیں کل یا پرسوں تک آ جائے گا جب تمہیں معلوم ہو گا کہ اس سیٹ کے لیے طاہر زمان کو چن لیا گیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گیا کیوں کہ اُس کا نام انٹرویو کے لیے پکارا جا رہا تھا۔ میں گم صم اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ''آج کل تو بس سفارش ہی چلتی ہے......'' میرے کانوں میں یہ ہی جملہ گونجتا رہا، یہاں تک کہ وہ واپس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا، وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، لیکن میں ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بھی بلایا گیا تو میں ہر قسم کے خدشے کو کمرے کے دروازے پر جھٹک کر مکمل اعتماد سے کمرے میں داخل ہوا...... میرا انٹرویو بہترین ہوا...... مجھے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں متاثر ہو جانے کی کیفیت نظر آ رہی تھی، مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ مجھے حتمی انٹرویو کے لیے ضرور بلائیں گے اور وہی ہوا، انٹرویو ختم ہو جانے کے بعد اُن لوگوں کے ناموں کی لسٹ بتا دی گئی جنہیں حتمی انٹرویو کے لیے اگلے ہی روز بلایا گیا تھا اور اس لسٹ میں میرا اور طاہر زمان کا نام ایک ساتھ ہی درج تھا۔

''اچھا یار!......کل ملیں گے......'' وہ اب بھی پُر اعتماد اور مطمئن تھا جیسے نوکری اُسی کی ہے۔

''ہاں دوست!...... کل ملیں گے......'' میں پہلی بار کھل کے مسکرایا اور اُس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

''اور ہاں...... سنو...... کل معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے پاس زیادہ بڑی سفارش ہے یا میرا مددگار زیادہ طاقت ور ہے......'' اُس نے حیرت سے میرے چہرے کی جانب دیکھا، لیکن میں اُس کی حیرت دُور کرنے کے لیے رکا نہیں۔

وہاں سے میں سیدھا اپنے گھر آیا تھا اور نمازِ ظہر کے بعد دو رکعت نمازِ حاجت ادا کی اور اپنے رب کے حضور جھک گیا...... میں نے بہت گڑگڑا کر اُس سے کہا تھا:

''مولا......! لوگوں کے پاس بہت اُونچی سفارشیں ہیں، لیکن میرا تو صرف تُو ہی مددگار ہے...... اور جس کا تُو مددگار ہو کامیابی تو بس اُسی کی ہوا کرتی ہے...... بس تُو میرے لیے کافی ہو جا......''

میری ماں اور بہن بھی نوافل ادا کر کے دُعا کرتی رہیں اور اگلے روز جب میں تیار ہو کر اپنی ماں سے دُعائیں لینے کو جھکا تو مجھے پختہ یقین تھا کہ میں کامیاب لوٹوں گا۔ انٹرویو آج بھی بہترین ہوا...... آج طاہر زمان زیادہ نہ بولا، وہ مجھ سے کھچا کھچا سا تھا، اُسے لگ رہا تھا کہ میرے پاس اُس سے بڑی سفارش ہے، مگر میں جانتا تھا کہ میرا بھروسہ تو اس پر ہے جو سفارش نہیں کرتا بلکہ حکم دیتا ہے اور چہار جانب بس اُسی کا حکم چلتا ہے سو مجھے مکمل یقین تھا کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا، لیکن جب نتیجہ کا اعلان کیا گیا تو میں دنگ رہ گیا...... طاہر زمان کو اس ملازمت کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

میں مایوس ہونے سے زیادہ حیران تھا۔ مجھے بہت عرصے تک یقین نہیں آیا کہ میری سب دُعائیں، نوافل رائیگاں چلے گئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے...... بہرحال چند مہینے بعد مجھے ایک اور ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ یہ نچلے گریڈ کی ملازمت تھی، لیکن میں مطمئن تھا۔ پہلی ملازمت نہ ملنے کے باوجود میں نے اللہ سے شکوہ نہ کیا تھا۔ مجھے لگا یہ ہی میرے حق میں بہتر ہو گا اور اسی میں میرے رب کی کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔ وقت گزرتا رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ترقی کے زینے پر چڑھتا چلا گیا۔ میرے افسران مجھ سے بے حد خوش تھے اور میری ذہانت اور شرافت کو بے انتہا سراہتے تھے۔

اور پھر میری زندگی میں ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہ نوجوان جو اس کمپنی میں معمولی اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر تعینات ہوا تھا وہ گیارہ بارہ سال کے عرصے میں ترقی کرتا کرتا کمپنی کا اعلیٰ ترین افسر بن چکا تھا۔

دوسری طرف وہ کمپنی جس نے مجھے طاہر زمان کے مقابلے میں مسترد کیا تھا آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہوتی چلی گئی اور آخرکار ہماری کمپنی نے اُسے خرید لیا یوں اس کی اپنی حیثیت ختم ہو گئی اور اُس کے تمام سٹاف کو بھی ہماری کمپنی میں مختلف جگہوں پر ذمہ داریاں دے دی گئیں۔ میرے شعبے میں جن تین لوگوں کو بھیجا گیا تھا وہ میرے سامنے موجود تھے۔ جن میں سے ایک وہی طاہر زمان تھا جس نے کہا تھا۔ ''آج کل تو بس سفارش ہی چلتی ہے۔''

آج بارہ سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ واقعی میرا یقین درست تھا، میرا رب بہترین مددگار ہے۔ میں جان گیا تھا کہ وہ چاہتا تو مجھے وہ ملازمت بھی مل سکتی تھی، مگر میرا رب مجھے آزما کر اُس سے بہتر چیز دینا چاہتا تھا۔ اور آج وہی طاہر زمان جو اپنی سفارش پر نازاں اور پُریقین تھا آج میرے مددگار نے اُسے میرے ماتحت کے روپ میں میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ میں یک دم مسکرا اٹھا۔ میرے اس طرح مسکرانے پر وہ گھبرا کر میری جانب دیکھنے لگا۔

''جی آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ آپ ہمارے سٹاف میں اچھا اضافہ ثابت ہوں گے۔'' میں نے چند رسمی سی باتیں کر کے انہیں سیکرٹری صاحب کے پاس بھیج دیا جو انہیں اُن کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے والے تھے۔

انہیں بھیج کر میں نے اپنی کرسی سے پشت ٹکا دی اور سکون سے آنکھیں بند کیں...... آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے طاہر زمان کو یہ سب جتایا کیوں نہیں...... میں چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا...... سچ پوچھئے تو ایک لمحے کو میرے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ میں اُس سے پوچھوں کہ اب بتاؤ کہ تمہاری سفارش آخرکار تمہیں کہاں پہنچا سکی اور دیکھو میرے مددگار نے مجھے کہاں پہنچا دیا ہے، مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ اللہ تعالیٰ پردہ پوشی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ میں نے طاہر زمان کو شرمندہ ہونے سے بچا کر نہ جانے خود کو آگے آنے والی کتنی شرمندگیوں سے بچا لیا تھا۔

سلسلہ ''کھوج لگائیے'' میں ان بچوں کے جوابات بھی درست تھے

سارہ خالد، راول پنڈی۔ عائشہ نور، گوجرانوالہ۔ فاطمہ اصغر، لاہور۔ صباء پروین، کوٹری۔ محمد عمر معاذ، بہاول پور۔ حبیبہ ساجی، منڈی بہاؤ الدین۔ حافظ محمد الیاس، خوشاب۔ سعد خالد ظفیر، گوجرانوالہ۔ داؤد احمد، گجرات۔ فریحہ آفتاب انصاری، میرپور۔ ثمرن عظیم، اسلام آباد۔ عائشہ رضا، کراچی۔ حارث عبداللہ، فتح جنگ۔ ایمن اسماعیل، ملتان۔ محمد اسامہ عارف، میاں والی۔ شہزاد صغیر، جھنگ۔ فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ حسن بٹ، شیخوپورہ۔ محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ۔ سید محمد عادل ہاشمی، علی عمران، لاہور۔ عائشہ شوکت اعوان، شیخوپورہ۔ محمد عمیر، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عبدالعزیز، کراچی۔ محمد شیراز، گوجرانوالہ۔ آمنہ ملک، راول پنڈی۔ ابن عزیز، محمد عمر شفقت، لاہور۔ عبدالقدیر خان، ملتان۔ محمد سعد، گوجرانوالہ۔ محمد ہادی گوندل، لاہور۔ شہلا جاوید، ملتان۔ مآب زینت، جہلم کینٹ۔ شیخ اسامہ وارث، اوکاڑہ۔ محمد سعد خلیل، ملتان۔ انجم اعجاز، گوجرہ۔ شہزاد ستار بھٹی، وہاڑی۔ ہارون اسحاق، گوجرانوالہ۔ مرزا فرحال بیگ، حیدرآباد۔ انیق احمد، کراچی۔ محمد وحید راول پنڈی۔ ابراہیم یامین، گوجرہ۔ راؤ عدنان، خانیوال۔ محمد باسط خان، میاں والی۔ اویس احمد، لاہور۔ شاہ زیب علی، سرگودھا۔ عبیداللہ عباسی، پشاور۔ فہد زمان، کرک۔ اقراء مطلوب، میرپور۔ عبداللہ وسیم، بنوں۔ حسن شکیل، کوئٹہ کینٹ۔ حمزہ خان، ارشاد الٰہی۔ اختر جمال، کراچی۔ تحسین گل، لاہور۔ مائرہ، سیال کوٹ۔ ریاض الحسن، دینہ۔ اسد علی، اسلام آباد۔ روبینہ شاہین، ملتان۔ خواجہ مظہر علی، میاں چنوں۔ شاہد اقبال، گوجرانوالہ۔ الیاس شامی، لاہور۔ سعد رضوان، عمر رضوان، سرگودھا۔ خلیق احمد، کراچی۔ جمال احمد، کمال احمد، مریدکے۔ خنساء اشرف، لاہور۔ رفاقت علی، کراچی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

''اَلعَزِیزُ جَلَّ جَلَالُہٗ''

(سب پر غالب)

تعریف: ''اَلعَزِیزُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کے مقابلے میں جو دشمن بن کر آ جائے تو وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے میں سخت ہے اور جب کسی کو سزا دینے کا ارادہ فرمائے تو کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کی سزا کو ہٹا سکے۔

تشریح: یہ نام مبارک قرآن کریم میں 92 مرتبہ آیا ہے۔ ''اَلعَزِیزُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' ایسی طاقت والا ہے جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اُس کے قبضے سے کوئی اپنے آپ کو نہیں چھڑوا سکتا۔ مخلوق میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ جو ہر غالب پر غالب اور ہر قادر پر قادر ہے۔

وہی اللہ ہے جو دُنیا میں ایک کو دُوسرے پر غلبہ دیتا ہے، مثلاً استاد کو شاگردوں پر کہ شاگرد استاد کی ماتحتی میں ہوتے ہیں۔ کسی کو معلّمہ بنایا، بڑا بھائی ہونا، کسی کو ہوٹل کا مالک بنایا اور ہوٹل کے مزدور اس کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں، کسی کو بادشاہ بنا کر اُسے رعایا دے دی سب کو یہ مقام دینے والے ایک اللہ تعالیٰ ہیں جو ''اَلعَزِیزُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' ہیں۔

تجسس

''وہ بہت بڑی فوج لے کر مکہ روانہ ہوا۔'' دادا جان نے کہا۔

''کون بہت بڑی فوج لے کر روانہ ہوا؟'' حمزہ جو آج کہانی سننے دیر سے پہنچا تھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دادا جان کا صرف یہی جملہ سن پایا تھا۔ تجسس سے پوچھتے ہوئے دادا جان کے قریب آ بیٹھا۔

''پیٹو! تم پہلے کہاں تھے؟ ابھی آتے ہی پوچھنے لگے ہو۔'' حذیفہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا جو بڑے غور سے کہانی سن رہا تھا۔ اس کی کہانی کا مزہ کر کرا ہو گیا تھا۔

''دادا جان! آپ یہیں سے شروع کر دیں یہ پہلے کیوں نہیں آیا۔ اسے ہر وقت کھانے کی فکر لگی رہتی ہے پیٹو کہیں کا۔'' حذیفہ نہیں چاہتا تھا کہ کہانی دوبارہ شروع کی جائے۔ وہ کہانی کا تسلسل ٹوٹنے پر بُرے بُرے منہ بنا رہا تھے۔

''دادا جان غلطی ہو گئی، آئندہ تاخیر نہیں کروں گا۔'' حمزہ فرحان نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معصوم سی صورت بنائی تو دادا جان

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسکرا دیے۔

''شاباش بیٹا! اپنی غلطی ہو تو فوراً مان لینی چاہیے، اور بیٹا حذیفہ! چلو کوئی بات نہیں کہانی دوبارہ سے شروع کر دیتے ہیں۔'' حمزہ آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔ چھوٹوں سے محبت والا معاملہ کرنا چاہیے۔ دادا جان نے سمجھانے والے انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔

''جی! ٹھیک ہے دادا جان کہانی دوبارہ سنایئے۔'' حذیفہ نے بات مانتے ہوئے کہا۔

''حمزہ بیٹا تو میں سنا رہا تھا کہ آج سے تقریباً پندرہ سو سال کی بات ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اس واقعے کے چالیس سال بعد آپ پیدا ہوئے۔ ملک یمن کا ایک گورنر تھا۔ جس کا نام ابرہہ تھا۔

اس کے ملک سے لوگ حج کرنے بیت اللہ آتے تھے۔ شیطان نے ابرہہ کو بہکایا اور اس کے دماغ میں بیت اللہ کی دشمنی بھر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ حج کرنے بیت اللہ نہ جائیں بلکہ اس کے پاس یمن آئیں۔ اس نے ایک بڑا کلیسا (عبادت خانہ) بنوایا۔ وہ کلیسا اتنا بلند تھا کہ اس کی بلندی پر نیچے کھڑا ہوا آدمی نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ وہ کلیسا سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے بنوایا گیا تھا، لیکن پھر بھی لوگ مکہ ہی جاتے۔ اور اس کے عبادت خانے میں آتے تھے۔

اس نے پوری مملکت میں اعلان کروا دیا کہ اب یمن سے کوئی کعبہ کے حج کے لیے نہ جائے۔

''اوئی!''

''کیا ہوا؟'' حذیفہ کی آواز پر دادا جان نے کہا۔

''دادا جان! حمزہ نے چٹکی بھری ہے۔'' حذیفہ نے حمزہ کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''قسم سے دادا جان! میں نے کچھ نہیں کیا۔'' حمزہ نے اپنی صفائی بیان کرتے ہوئے کہا۔

''دادا جان! یہ پن لگی ہے۔'' حمزہ نے پن دکھائی۔

بیٹا!''اس طرح کی چیز فوراً بیگ میں ڈالتے ہیں۔ دیکھو یہ چبھ گئی نا۔''

یہ پن حذیفہ ہی بھولا تھا۔ حذیفہ اپنی غلطی پر جھینپ سا گیا۔

''چلو آئندہ خیال رکھنا۔'' دادا جان نے کہا۔

''تو بات کیا ہو رہی تھی۔'' دادا جان نے پوچھا تو حمزہ نے کہا:

''لوگ یمن کے بادشاہ کے عبادت خانے میں نہیں آتے تھے۔''

''ہاں! لیکن اس بادشاہ کا نام کیا تھا؟'' دادا جان نے پوچھا تو دونوں اُن کا منہ تکنے لگے۔ دونوں سوچنے لگے۔ میرے بیٹوں! یہ توجہ نہ دینے کا نتیجہ ہے۔

''وہ آ گیا...... دادا جان اس کا نام ابرہہ تھا۔''

ابرہہ کے بنائے ہوئے عبادت خانے میں لوگ نہ آئے جو اس نے بیت اللہ کے مقابلے میں بنایا تھا۔ بیت اللہ کی عظمت اس وقت سب ہی کافروں کے دلوں میں تھی۔ چناں چہ کسی بدو نے نفرت سے ابرہہ کے عبادت خانے کو گندا کر دیا۔ اب بادشاہ غصے سے بپھر گیا۔ اُس نے کہا اب میں مکہ جا کر بیت اللہ کو ڈھا دوں گا۔ وہ بہت بڑی فوج لے کر مکہ روانہ ہوا۔ اس کی فوج میں ایک ایسا ہاتھی بھی تھا جس کی مثال اس وقت دُنیا میں نہ تھی۔

''اس کی فوج میں کتنے سپاہی تھے؟'' حمزہ نے پوچھا۔

اس کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہی اور تیرہ ہاتھی تھے۔

ابرہہ نے راستے میں دو بڑے قبائل کو بھی شکست دی تھی۔

مکہ پہنچ کر اُس نے لوٹ مار کی اور لوگوں کی اونٹ، بکریاں سب اپنے قبضے میں لے لیے۔ ان اونٹوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ تھے۔

بادشاہ نے اعلان کروایا کہ وہ صرف کعبہ کو ڈھانے آیا ہے کوئی اس سے مقابلہ نہ کرے اور اگر مقابلہ کیا تو اس کو تہس نہس کر دیا جائے گا۔

عبدالمطلب اہل مکہ کے سردار تھے۔ ہر ایک اُن کی عزت کرتا تھا۔ لوگوں نے کہا آپ اس بادشاہ کے پاس جائیں اور اُسے کعبہ پر حملے سے روکیں۔

جب عبدالمطلب، ابرہہ سے ملنے گئے تو اس پر ایک رعب طاری ہو گیا۔ بڑی عزت سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور بڑے ادب سے پوچھا کہ آپ نے کیا سوچا ہے؟ عبدالمطلب نے بڑے پُرسکون انداز میں جواب دیا کہ آپ کی فوج نے میرے اونٹ لوٹے ہیں وہ مجھے لوٹا دیجیے۔ یہ جواب سن کر ابرہہ حیرت میں پڑ گیا کہ اُس نے بجائے کعبہ کو بچانے کی بات کرنے کے صرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے اونٹوں کے بچانے کی بات کی ہے۔ ابرہہ نے کہا:

''آپ کے آنے سے میرے دل میں رعب پڑ گیا تھا مگر جب آپ نے صرف اونٹوں کی بات کی تو میرے دل سے آپ کا رعب ختم ہو گیا۔''

عبدالمطلب نے ابرہہ سے کہا: ''اونٹ میرے ہیں مجھے اپنے اونٹوں کی فکر ہے اور بیت اللہ کا مالک میں نہیں بلکہ اس کا مالک ایک عظیم ہستی ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔''

ابرہہ اپنی فوج کی طاقت کے نشے میں تھا۔ وہ کعبہ پر حملے سے باز نہ آیا اور کہنے لگا: ''تمہارا خدا اُس کو میرے ہاتھ سے نہ بچا سکے گا۔''

عبدالمطلب نے کہا: ''پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرو۔''

عبدالمطلب نے واپس آ کر اہل مکہ کو جمع کیا اور کہا کہ ہم ابرہہ کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے بال بچوں اور مال اسباب سمیت آس پاس کی پہاڑیوں پر چلے جائیں۔ دادا جان نے ذرا توقف کیا۔

جوں جوں کہانی نقطۂ عروج پر جا رہی تھی بچوں کے چہروں پر سنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

دادا جان پھر بولے: ''دوسرے روز ابرہہ ساٹھ ہزار فوج اور تیرہ ہاتھیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھا۔ ابرہہ سب سے آگے تھا۔ جیسے ہی اُس کا ہاتھی مکہ کی حدود میں داخل ہوا تو اس کا ہاتھی بیٹھ گیا۔ مہاوتوں نے پہلے کوشش کی کہ وہ از خود اٹھ جائے، مگر وہ نہیں اٹھا۔ اور پھر اس ہاتھی کو اتنا مارا کہ وہ زخمی ہو گیا اُس کی ناک میں آنکڑا (لوہے کا) ڈال دیا، مگر ہاتھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ اگر مہاوت ان ہاتھیوں کا رُخ کسی اور طرف موڑتے تو وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور بھاگنے لگتے اور جوں ہی اُن کا رُخ مکے کی جانب پھیرا جاتا وہ بیٹھ جاتے۔'' ابرہہ تنگ آ گیا۔ اس کی فوج پریشان ہو گئی، مگر پھر بھی اُسے عقل نہ آئی۔ اچانک آسمان پر چاروں طرف سے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ آنا شروع ہو گئے۔ بہت سارے چھوٹے چھوٹے پرندوں نے ان پر حملہ کر دیا اور حملہ بھی توپوں، بمباری سے نہیں بل کہ ان کی چونچ میں چھوٹے چھوٹے کنکر تھے جسے وہ اُوپر سے پھینکتے۔ وہ کنکر کیا تھے ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقت ور تھے۔ جس ہاتھی یا جس سپاہی کو وہ کنکر لگتا تو سر سے نکلتا ہوا پاؤں تک پہنچ جاتا۔ ان کے جسم سے پانی، خون، پیپ بہنے لگتا۔ ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر گرنے لگتے، جسم سڑنے لگتا۔ اس کے ہاتھی بُری طرح سے چنگھاڑتے اور گھوڑے ہنہناتے۔ ابرہہ کی فوج پر خوف اور دہشت طاری ہو گئی۔ ان کے جسم کٹ کٹ کر ایسے ہو گئے جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھس۔ ابرہہ کی فوج تباہ و برباد ہو گئی۔ خود ابرہہ کا جسم بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ابرہہ کے ہاتھی ''محمود'' کے دو ہاتھی بان یہیں مکہ مکرمہ میں رہ گئے، مگر اس طرح کہ دونوں اندھے اور اپاہج ہو گئے۔ یہ سزا اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت کر کے دکھائی جو ہر ایک پر غالب ہے۔''

حمزہ اور حذیفہ بڑے غور سے واقعہ سن رہے تھے۔

''دادا جان! یہ واقعہ قرآن کریم میں آیا ہے؟''

''جی بیٹا! آپ نے سورۂ فیل پڑھی ہے نا۔''

''جی...... جی......'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

یہ واقعہ سورۂ فیل میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بڑائی پر مشتمل کہانی سن کر دونوں ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے اپنے بستروں کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

انمول باتیں

☆ اپنی سوچوں کو پانی کے قطروں کی طرح شفاف رکھو کیوں کہ جس طرح پانی کے قطروں سے دریا بنتا ہے اسی طرح سوچوں سے ایمان بنتا ہے۔

☆ زندگی کے دُکھ انسان کو انسان بناتے ہیں۔ اس لیے دُکھوں کا مقابلہ آنسوؤں سے نہیں بلکہ حوصلے سے کرنا چاہیے۔

☆ غصہ عقل کی موت ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو کیوں کہ مایوسی گناہ ہے۔

☆ خیرات مال میں اضافہ کرتی ہے۔

☆ صبر اور خاموشی سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔

☆ موت سے غفلت لمبی اُمیدوں کی وجہ سے ہے۔

☆ جس نے اپنے ماں باپ کا ادب کیا اُس کی اولاد بھی مؤدب ہوگی۔

(عروج فاطمہ، لاہور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

کُٹ کُٹ کٹاک

مجیب ظفر انوار حمیدی

آج کل بی مُرغی نہایت غرور کے ساتھ گردن اکڑائے ہوئے پورے صحن میں گھوما کرتیں اور حسن اور سعد میاں لاکھ اُن کی خوشامد کرتے کہ ہم سے دوستی کرلو، مگر مجال ہے کہ وہ دونوں بھائیوں کی بات پر کان دھریں۔ وجہ اُس کی ابّا نے ایک دم بتادی کہ میاں بات یہ ہے کہ بیگم کُٹ کُٹ کٹاک آج کل پابندی سے ایک انتہائی خوب صورت اور دل کش انڈا دے رہی ہیں جو ایک دن سعد میاں اور ایک دن حسن میاں کھا رہے ہیں، اس لیے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لا رہی ہیں۔

ابّا کی بات سُن کر محمد حسن نوید میاں فوراً اپنی کہانیوں کی کتاب لائے اور اُس میں سے ''غرور کا سر نیچا'' کہانی بی بی کُٹ کُٹ کٹاک کو پوری کی پوری فٹافٹ سنا دی، لیکن وہ کہانی سُن کر اور تیزی سے کُٹ کُٹ کٹاک ــــ کُٹ کُٹ کٹاک ــــ کرنے لگیں۔ اس پر حسن میاں چڑ کر بولے:

''بالکل ٹھیک نام رکھا ہے ابّا نے تمہارا بی مُرغی ـــ تم کُٹ کُٹ کٹاک ہی ہو ـــ ہو ہو ہوو!!'' اتنا کہہ کر حسن میاں ہنسنے لگے اور سعد آگے بڑھ کر کُٹ کُٹ کٹاک کو چھونا چاہتے تھے کہ وہ چیخیں: ''کُٹ کُٹ کُٹ ـــ کٹاک ـــ کٹاک ـــ کُٹ کُٹ کٹاک ـــ! (یعنی سعد میاں پیچھے ہٹ جاؤ، ابھی ہمارا دوستی کا موڈ نہیں ہے) سعد میاں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئے اور حسن کو دیکھتے ہوئے بولے:

''بھائی ـــ جے ـــ جے ـــ دوستی نہیں ـــ'' (بھائی یہ دوستی نہیں کر رہی ہے) ''نہیں'' پر سعد میاں نے اپنا ننھا سا گول مٹول سَر پورے زور و شور سے انکار میں ہلایا۔ حسن میاں کو بہت افسوس ہوا اور بی بی کُٹ کُٹ کٹاک سے بولے:

''ہماری پہلے والی مُرغی بہت اچھی تھی، ایک دن اُس نے ایک ساتھ دو انڈے دیے تھے، یو ـــ یو ـــ امّاں نے حلوے کے لیے ٹوکری میں جمع کر لیے تھے، وہ ہمارے بستر پر آ کر کھیلتی بھی تھی اور روٹی بھی کھاتی تھی ـــ تم تو فضول ہو ـــ روز ایک انڈا دے کر تم ہم پر احسان تو نہیں کر رہی ہو، باؤ ـــ باؤ!!!'' اتنا کہہ کر حسن میاں نے بی بی کُٹ کُٹ کٹاک کو خوب ڈرایا اور سعد کا ہاتھ تھام کر بولے:

''غرور نہیں کرو ورنہ امّاں تمہارا پلاؤ پکا کر بابا کو کھلا دیں گی ـــ باؤ ـــ ہاہاہا!!!'' حسن میاں خوب ہنسے اور اب تو بی بی کُٹ کُٹ کٹاک کو جیسے جلال آ گیا، انھوں نے اپنی کُٹ کُٹ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پورا آنگن سر پر اُٹھالیا۔ یہ شور وغل سُن کر اندر سے اماں کی آواز آئی:

''حسن۔۔۔۔سعد پھر گئے تم لوگ نئی مُرغی کے پاس، کاٹ لے تو میرے پاس مت آنا، یہ پٹ پٹ پٹاک جیسی نہیں ہے، وہ بڑی سادہ لوح اور بھولی بھالی مُرغی تھی، یہ خاصی تیز ہے، دو چار ہفتوں میں یہ مانوس ہوجائے گی، مت تنگ کرو اسے، حسن۔۔۔۔سعد!!!'' اماں دونوں کو پکارتی باہر نکل آئیں۔ اُن کو دیکھتے ہی دونوں بھاگے اور حسن میاں جاتے جاتے بولے:

''لمّاں، پٹ پٹ پٹاک کو خالہ جان لے گئیں، آپ اُن کو کٹ کٹ کٹاک کو دے دیں اور اپنی پٹ پٹ پٹاک کو واپس لے آئیں!''

''اے ہے واپس کیسے لے آؤں، میری پلی پلائی مُرغی ہے وہ، نازوں کی پالی، سعیدہ کے بچوں کو ڈاکٹر نے نومبر دسمبر میں روزانہ دیسی انڈا کھانے کو بتایا ہے تو میں نے وقتی طور پر اپنی پٹ پٹ پٹاک کو دے کر مائی نوراں بھاگی سے اس کو خریدا ہے، تم دونوں اسے تنگ نہ کرو، یہ مانوس ہو جائے گی ایک آدھ مہینے میں۔'' اماں بولیں۔

''اماں یہ تو مانوس ہو چکی ہے اور کتنا مانوس ہو گی، یہ کاٹ لے گی مجھے اور سعد کو!'' حسن میاں کے معصوم چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔

''کٹ کٹ کٹاک۔۔۔کٹ کٹ کٹاک۔۔۔۔کٹ کٹ کٹاک!!!'' بی مُرغی نے پورے زور کے ساتھ شاید یہ کہنے کی کوشش کی کہ براہ کرم میری ذات پر مزید کیچڑ نہ اُچھالی جائے، میں روزانہ انڈا دے رہی ہوں، اس پر مجھے کوئی انعام وغیرہ بھی دیا جائے۔

شام کی چائے پر حسن میاں نے ابا سے کہا: ''ابا! آپ دوسری مُرغی لے آئیں جو دن میں سکس، سیون، ٹین تک انڈے دے، جب وہ مرغی دس بارہ انڈے دے گی تو میں ارسلان کو بھی دے آؤں گا اور زین کو بھی۔ یہ تو چھوٹا سا ایک انڈا دیتی ہے۔ وہ بھی بھورا بھورا سا براؤن براؤن ہوتا ہے۔۔۔یو۔۔یو۔۔۔مزے کا تو ہوتا ہے لیکن سعد اُس کی زردی کو کپڑوں پر لگالیتا ہے!''

''ٹھا ٹھا ٹھا۔۔۔ہاہاہا۔۔ہو ہو ہو!!'' ابا خوب ہنسے اور بولے: ''اچھا اب سمجھا، تم بیگم کٹ کٹ کٹاک کی بُرائی کرکے یہ چاہ رہے ہو کہ میں اسے میاں صاحب کے مُرغی خانے میں دے آؤں اور تمہارے لیے کسی اسپورٹس مُرغی کا انتظام کروں تو میاں اگر یہ تم سے فری ہوگئی تو تم دونوں اسے بھی آئس کریم کھلاؤ گے تو یہ بھی بھاگ جائے گی۔۔۔بس اسی پر گزارا کرو!'' ابا کا حتمی انکار سُن کر حسن میاں کا منہ لٹک گیا وہ کچھ سوچ کر بولے:

''ٹھیک ہے ابا! میں اور سعد ایک دو دن انتظار کرلیتے ہیں ۔۔یو۔۔یو۔۔۔احمد ہماری جماعت میں نیا نیا آیا تھا تو کسی سے بھی بات نہیں کرتا تھا۔۔۔پھر۔۔۔پھر۔۔۔''

''کیا وہ بھی کٹ کٹ کٹاک کیا کرتا تھا۔۔۔'' ابا حسن میاں کی بات کاٹ کر جلدی سے بولے۔

''جی ہاں۔۔۔۔وہ بھی کٹ۔۔۔!'' اتنا کہہ کر حسن میاں چونکے کہ وہ اپنے دوست کو کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ ہچکچا کر ابا کو دیکھنے لگے جو ہنس رہے تھے۔ حسن کو کبھی کبھی ابا پر بھی غصہ آتا تھا۔ وہ ابا سے بگاڑ کر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر اُن کو کہانیاں اور نظمیں کون سناتا، مزے مزے کی چیزیں کون کھلاتا؟ خوب سیر کون کراتا؟ اُن کی خاموشی پر سب خوب ہنسے۔ لمّاں بولیں: ''میرے شہزادے کا مذاق نہ اُڑایا کریں آپ، جاؤ حسن ماما سے پوچھ کر آؤ ٹوکری میں کتنے انڈے جمع ہوگئے ہیں بی بی کٹ کٹ کٹاک کے، تم دونوں کو حلوہ بنادوں گی، آج سردی زیادہ ہے۔''

'اوہو۔۔۔اوہو۔۔۔حلوہ۔۔۔حلوہ۔۔۔۔'' حسن میاں اُچھلتے ہوئے باورچی خانے کی جانب لپکے۔ سعد زور سے بولے: ''اماں۔۔۔۔حلوہ نہیں۔۔۔۔ایسے ہی۔'' (یعنی اماں میں حلوہ نہیں کھاؤں گا، مجھے انڈے اسی طرح سے دے دیں!''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کیا کچے انڈے پیو گے تم سعد، حلوہ بنا رہی ہوں وہ کھانا، چلو اب ہوم ورک کرو میں بستہ چیک کروں گی آج تمہارا، کل بھی تمہارے بستے سے ڈکار چورن نکلا تھا، اور تم نے کہا کہ حسن نے رکھا تھا، میرا حسن ایسی چیزیں نہیں کھاتا!''

''امّاں نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ بھائی نہیں ۔۔۔ وہ بابر ۔۔۔'' (ہاں اماں وہ بھائی نے نہیں بابر نے رکھا تھا)۔ اماں جانتی تھیں کہ اُن کے بچے جھوٹ کبھی نہیں بولتے، لہٰذا وہ مسکرانے لگیں اور سعد کو قریب بلا کر پیار کرنے لگیں۔ سعد میاں تو انڈوں کو جھپٹ کر توڑا کرتے تھے۔ اب بھی موقع کی تلاش میں تھے کہ اماں اور بھائی اِدھر اُدھر ہوں تو وہ باورچی خانے میں جا کر بی بی ٹُٹ ٹُٹ کٹاک کے انڈے توڑیں گے۔ یہ سوچ کر وہ مُسکرائے۔ اتنے میں حسن نے آکر بتایا کہ امّاں میں نے خود گنے ہیں پورے بیس انڈے ہیں، ماما بتا رہی ہیں کہ دس بابا لائے تھے اور دس ٹُٹ ٹُٹ نے دیے ہیں۔

''چلو اچھا ہوا، سب کا حلوہ بنا کر رکھ دوں گی، مگر تمہارے ابّا نہ کھالیں چُھپ کر!'' اماں بولیں۔

''نہیں بیگم، آپ تو جانتی ہیں کہ ہم شوگر کی بیماری کی وجہ سے میٹھا نہیں کھاتے۔'' اتنا کہہ کر وہ ہنسے۔ حسن سمجھ گئے کہ اب پھر ابّا انہیں اور سعد کو پیار کریں گے کہ چائے پھیکی ہو رہی ہے۔ ابّا کا کہنا تھا کہ اپنے پوتوں کو پیار کرنے سے ان کی چائے میٹھی ہو جاتی ہے۔ بھاگو یہاں سے۔ چنانچہ انہوں نے سعد میاں کے ساتھ باہر دوڑ لگادی۔

بی بی ٹُٹ ٹُٹ کٹاک پورے زور و شور سے حسن اور سعد کے بستر پر اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ گھر میں صرف ابّا تھے جو ظہر کی نماز پڑھ کر سو رہے تھے۔ اماں، ماما، حسن اور سعد، خالہ جان کے گھر گئے ہوئے تھے اور بابا اپنے دفتر تھے۔ ایسے میں اللہ جانے کُنڈی والا پنجرہ کیسے کُھل گیا کہ بی ٹُٹ ٹُٹ باہر نکل آئیں اور پچھلی کھڑکی کے راستے حسن اور سعد کے کمرے میں آن دھمکیں۔ اُجلی اُجلی چادر والا صاف سُتھرا بستر دیکھ کر ان کا جی للچایا اور اپنے گندے مندے پنجوں کے نشان بناتی پورے بستر پر ''ٹُٹ ٹُٹ کٹاک ۔۔۔ ٹُٹ ٹُٹ کٹاک ۔۔۔'' کرتی گھومتی رہیں، جب وہاں سے اُن کا جی بھر گیا تو لکھنے والی میز پر چڑھ گئیں، میز سے الماری، الماری سے برتنوں کے شیلف، وہاں سے کتابوں کے ننھے سے ریک پر چڑھیں۔ اب تو بی بی ٹُٹ ٹُٹ کٹاک کے مزے ہو گئے۔ وہ یہ بات بھول گئیں کہ کسی کی غیر موجودگی میں اُس کے کمرے میں داخل ہونا کتنی بُری بات ہوتی ہے۔ انہیں خوب مزا آرہا تھا اور وہ پورے انہماک کے ساتھ اپنے ٹُٹ ٹُٹ کٹاک کے گانے کو گا رہی تھیں۔ اچانک ابّا کو سوتے میں کچھ محسوس ہوا، اُن کی آنکھ کُھل گئی اور وہ گھبرا کر بولے:

''ارے یہ تو ٹُٹ ٹُٹ کی آواز ہے، یہ کہاں ہے اس وقت۔'' اتنا کہہ کر وہ اُٹھے اور باہر لپکے۔ ذرا سی دیر میں بی بی ٹُٹ ٹُٹ اپنے پنجرے میں تھیں۔ ابّا اُن کو پکڑنے میں ہانپ گئے اور پنجرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولے: ''ٹھیک کہتے ہیں میرے پوتے تم نہایت شریر مُرغی ہو!''

شام کو چائے کی میز پر ابّا نے یہ واقعہ حسن اور سعد کو بھی سنایا تو وہ خوب ہنسے۔ حسن میاں بولے:

''ابّا ۔۔۔ آپ ٹُٹ ٹُٹ سے دوستی ہی کرادیتے ہماری، وہ اسی لیے آئی ہوگی!''

''نہیں بھائی، ٹُٹ ٹُٹ، دوستی نہیں!'' سعد جلدی سے بولے کہ (نہیں بھائی ۔۔۔ ٹُٹ ٹُٹ سے دوستی نہیں کرنی) لیکن حسن میاں کو تو جیسے یقین تھا کہ ٹُٹ ٹُٹ اُن سے دوستی کرنے آئی تھی۔ اسی شام کو مغرب سے پہلے بابا کے آنے کا وقت ہو رہا تھا کہ حسن میاں جلدی سے ٹُٹ ٹُٹ کے پنجرے کے پاس گئے اور ایک بہت پیاری سی کتاب کھول کر بی بی ٹُٹ ٹُٹ کو ایک اچھی سی نظم سنانے لگے: ''بول میرے مُرغے، کُکڑوں کوں، ہاں ہاں یوں، ککڑوں کُوں!!'' اتنا سُن کر تو بی بی ٹُٹ ٹُٹ نے خوب شور مچایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

محمد حسن نوید میاں خوب غصہ ہوئے اور چڑ کر بولے: ''مغرور موٹی مُرغی، اتنی اچھی نظم سُنا رہا ہوں تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور تم ہو کہ شور مچا رہی ہو۔ سر میں درد کر دیا ہے تم نے اپنی کٹ کٹ سے۔۔۔ چلو جاؤ ہم نہیں بول رہے تم سے!''

اتنا کہہ کر حسن میاں اندر آئے اور ابا کو پورا ماجرا سُنایا۔ یہ سُن کر ابا خوب ہنسے اور بولے: ''ٹھا ٹھا ٹھا۔۔۔ ہو ہا ہا۔۔۔ ارے اس میں بے چاری کٹ کٹ کی کیا خطا ہے، غلطی تو تمہاری ہے جو اُس کو مُرغے کی نظم سُنا رہے تھے جب کہ وہ تو مُرغی ہے بے چاری! ہا ہا ہا!!!''

یہ سُن کر تو حسن میاں چکرا کر رہ گئے اور بولے:

''ابا۔۔۔ کیا کٹ کٹ کو اُردو آتی ہے؟'' ابا خوب ہنسے اور اب اُن کے لیے ایک مشکل موقع تھا کہ حسن کو کس طرح سمجھانا تھا کہ بات اُن کی سمجھ میں آجائے، لیکن وہ بھی حسن میاں ہی کے ابا تھے، فوراً بولے: ''ارے ننھے میاں یہ جو پیارے پیارے جانور ہوتے ہیں، پودے ہوتے ہیں۔۔۔ یہ سب ہمارے دوست ہوتے ہیں۔۔۔ یہ پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔ تم نے پہلے دن ہی سے کٹ کٹ کو اپنا دوست نہیں سمجھا اور وہ بھی تم سے دُور ہوتی گئی۔ یاد رکھو ان بے زبانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیار کی زبان عطا کی ہے جو سب سے بڑی زبان ہے! ہاہاہا!!'' ابھی ابا پوری طرح سے ہنسے بھی نہ تھے اور محمد حسن نوید میاں اُن کی بات پر غور کر ہی رہے تھے کہ پیچھے سے زوردار آواز آئی: ''کٹ کٹ کٹاک کٹ کٹ کٹاک!!!'' سب نے مُڑ کر دیکھا تو پیچھے کھڑکی کے چوکھٹے میں بی بی کٹ کٹ اپنے پر پھیلائے یوں کھڑی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ ہاں ہاں حسن اور سعد میاں تمہارے ابا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں دوپہر کو تم دونوں بچوں سے دوستی کرنے آئی تھی، میں بچوں سے بہت پیار کرتی ہوں اور اللہ کے حکم سے اُن کے لیے روزانہ ایک انڈا بھی دیتی ہوں۔۔۔ آؤ باہر کھیلتے ہیں۔ یہ سوچ کر حسن میاں خوب اُچھلے اور سعد سے بولے: ''آؤ آؤ سعد ہم بی کٹ کٹ سے دوستی کر لیتے ہیں اور اس کو اب کبھی نہیں ستائیں گے کیوں کہ یہ ہمارے کام آتی ہے اور ہماری محسنہ بھی ہے۔'' حسن میاں نے خوب یاد کر کے اماں والی بات دُہرائی تو سعد نے خوب زور و شور سے سر ہلایا۔ ابا، اماں، بابا اور ماما سب کے سب ہنسنے لگے اور شاید بی کٹ کٹ کٹاک بھی ہنس رہی تھی کیوں کہ اب وہ آہستہ آہستہ کٹ کٹ کر رہی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

فیصل مسجد

فیصل مسجد پاکستان کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ جس کے ہال میں 74000 جب کہ ملحقہ صحن میں دو لاکھ نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ کچھ عرصے تک اسے دُنیا کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ یہ عرصہ 1986ء سے 1993ء پر

محیط ہے۔ مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں دُنیا کی اس خوب صورت مسجد کا نقشہ ترکی کے ماہرِ تعمیرات Vedat Dalokay نے تیار کیا۔ سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل نے اس مسجد کی تعمیر کے اخراجات برداشت کیے تھے۔ اسی لیے اس مسجد کو فیصل مسجد کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر 1976ء میں شروع ہوئی اور 1986ء کو مکمل ہوئی۔ مسجد کا نقشہ عرب خیمے کی مانند ہے۔ مسجد کے چار بڑے بلند و بالا مینار ہیں۔ جن کی بلندی 80 میٹر (260 فٹ) ہے۔ یہ مسجد 5000 مربع میٹر پر پھیلی ہے۔ مسجد کے ہال میں فانوس نصب ہے جو چین نے تحفتاً دیا تھا۔ دیواروں پر خوب صورتی سے قرآنی آیات کندہ کی گئی ہیں۔ یہ مسجد شاہراہ اسلام آباد کے اختتام پر واقع ہے۔ جس کے ساتھ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی بھی قائم ہے۔ نمازیوں کے علاوہ سیاحوں کی بڑی تعداد بھی اسے دیکھنے ہر سال یہاں آتی ہے۔

لیاقت علی خان

لیاقت علی خان کا شمار تحریک پاکستان کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ آپ پاکستان کے پہلے وزیراعظم تھے۔ آپ یکم اکتوبر 1896ء کو کرنال (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے علی گڑھ یونی ورسٹی اور آکسفورڈ ایکسٹر کالج (Exter College) (برطانیہ) سے تعلیم حاصل کی۔ آپ نے آزادیِ پاکستان کے عظیم رہنما، ایک وکیل اور سیاست دان کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ آپ 1947ء سے 1951ء تک پاکستان کے وزیراعظم رہے۔

جب کہ پاکستان کے پہلے وزیرِ دفاع اور وزیر برائے اُمور کشمیر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ 16 اکتوبر 1951ء کو کمپنی باغ (موجودہ لیاقت باغ) راول پنڈی میں اکبر ببرک خاں نامی شخص نے گولی مار کر آپ کو شہید کر دیا۔ قوم نے انہیں "شہیدِ ملت" کا خطاب دیا۔ آپ مزار قائداعظمؒ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ ان کے نام پر کئی تعلیمی ادارے، قصبے اور پارک کے نام رکھے گئے ہیں۔

مور

مور کو Peafowl بھی کہا جاتا ہے۔ نر مور کو "Peacock" جب کہ مادہ مور کو "Peahen" کہتے ہیں۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

پرندے کا خاندان "Phasianidae" سے تعلق ہے۔ نرمور اپنے خوب صورت پروں اور رقص کی وجہ سے دُنیا بھر میں مقبول ہے۔ اس کے نیلے، سبز، سفید، براؤن یعنی رنگ برنگے پَروں کی وجہ سے اس کا شمار خوب صورت پرندوں میں ہوتا ہے۔ یہ پرندہ جنگلوں میں رہتا ہے۔ درختوں پر بسیرا کرتا ہے۔ پھل، پھول، حشرات، سانپ، چھپکلی، مینڈک جو ملے کھا جاتا ہے۔ اس لیے انہیں اومنی وورز (Omnivores) کہتے ہیں۔ نرمور کے بڑوں پروں کی تعداد 20 تک ہوسکتی ہے۔ نرمور کی لمبائی 100 سے 115 سینٹی میٹر جب کہ زیادہ سے زیادہ 225 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ جب کہ مادہ مور 95 سینٹی میٹر تک لمبی ہوتی ہے۔ بھارت کا قومی پرندہ مور ہے۔ مور کی دو اقسام ہیں۔ جن کے نام سائنسی طور پر "Pavo Cristatus" اور "Pavo Muticus" ہیں۔

ہارس ریسنگ

ہارس ریسنگ (Horse Racing) ایک مقبول کھیل ہے جو دُنیا کے کئی ممالک میں کھیلا جاتا ہے۔ گھڑ سواری کے اس کھیل کو "Equestriain Sport" بھی کہتے ہیں۔ اس کھیل کی ابتداء شام اور مصر سے کئی صدیوں پہلے ہوئی۔ آج یہ کھیل اولمپکس کھیلوں کے علاوہ بھی کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کی تین اقسام ہیں۔ Flat Racing, Racing Over Jump اور Harness Racing شامل ہیں۔ گھڑ سوار کو Jockey (جوکی) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خطرناک کھیل ہے جس میں گھڑ سوار گر کر موت کے منہ میں بھی جا سکتا ہے۔ گھوڑے اک مخصوص ٹریک پر دوڑتے ہیں۔ مطلوبہ فاصلہ سب سے پہلے طے کرنے والا گھوڑا اور گھڑ سوار انعام کا حق دار قرار پاتا ہے۔ پاکستان میں لاہور ریس کلب (لاہور)، راول پنڈی ریس کلب (چکری) کراچی ریس کلب (کراچی) اور گجرات ریس کلب (گجرات) میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ جس میں لوگ بھرپور طریقے سے شرکت کرتے ہیں۔

☆☆☆

مختصر معلومات

- سفید بادلوں کا وطن نیوزی لینڈ کو کہتے ہیں۔
- سفید ہاتھیوں کی سرزمین تھائی لینڈ کو کہتے ہیں۔
- جزیروں کا دیس انڈونیشیا کو کہتے ہیں۔
- ملکہ صباء کی سرزمین ایتھوپیا کو کہتے ہیں۔
- کھیلوں کا بانی یونان کو کہتے ہیں۔
- سیاہ فام لوگوں کی سرزمین سوڈان کو کہتے ہیں۔
- زمرد کا جزیرہ آئرلینڈ کو کہتے ہیں۔
- موتیوں کا جزیرہ بحرین کو کہتے ہیں۔
- امن کی سرزمین انڈورا کو کہتے ہیں۔
- بحیرہ عرب کی کنجی عدن کو کہتے ہیں۔
- مچھلیوں کی سرزمین فن لینڈ کو کہتے ہیں۔
- ایشیاء کا کاسہ ایران کو کہتے ہیں۔

(انجینئر قانی، بہاول نگر)

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئیے مسکرائیے

خوش خبری

ایک آدمی کا ایک کروڑ روپے کا انعام نکلا۔ کمپنی کے مالک نے سوچا اچانک بتانے سے کہیں انعام حاصل کرنے والا خوشی سے مر نہ جائے۔ چنانچہ اُس نے منیجر سے کہا کہ اس کو یہ خوش خبری اس طرح سناؤ کہ اس کا ہارٹ فیل نہ ہو۔ منیجر نے اُس آدمی سے کہا "فرض کرو تمہارا ایک کروڑ کا انعام نکل آئے تو تم کیا کرو گے؟" آدمی نے یہ بات مذاق سمجھتے ہوئے نہایت لاپروائی سے جواب دیا میں آدھے روپے تمہیں دے دوں گا۔ منیجر یہ سن کر خوشی سے مرگیا۔

(شہباز علی، سرگودھا)

دُوسری بلی

ایک بار کسی گھر میں ایک چور اور اس کا شاگرد گھس گئے۔ چور کا پاؤں مکان کی چارپائی سے جا ٹکرایا تو مالک مکان کی آنکھ کھل گئی، چور نے بلی کی آواز نکالی۔ کچھ بعد چور کے شاگرد کا پاؤں بھی مالک مکان کی چارپائی سے ٹکرا گیا۔ اس کو بلی کی آواز نکالنا نہیں آتی تھی۔ اُس نے کہا: "دُوسری بلی۔"

(حمزہ اقبال، لاہور)

امیر

علی: "ابو! کل ہم امیر ہو جائیں گے۔"

ابو: "وہ کیسے؟"

علی: "کل ہمارے حساب کے ماسٹر صاحب ہمیں پیسوں سے روپے بنانے کا طریقہ بتائیں گے۔"

(رحمت علی، ساہی وال)

کان

جج نے سزا سناتے ہوئے کہا: "مجرم کے دونوں کان کاٹ دیے جائیں۔"

مجرم: "ایسا مت کریں میں اندھا ہو جاؤں گا۔"

جج: "وہ کیسے؟"

مجرم: "اگر میرے کان کاٹ دیے جائیں گے تو میں چشمہ کیسے لگاؤں گا۔"

(ارسلان احمد، کوئٹہ)

مونچھ کا بال

ایک پہلوان ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے گیا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ہوٹل کے منیجر نے خوشامدی لہجے میں کہا: "واہ پہلوان! کیا مونچھیں ہیں اس کا تو ایک ایک بال لاکھ روپے کا ہے۔"

جب پہلوان جی کھانا کھا چکا تو اس نے اپنی مونچھ کا ایک بال بیرے کو دیتے ہوئے کہا: "تین سو روپے کاٹ کر باقی پیسے واپس لے آؤ۔"

(دانیال احمد، کراچی)

دُوسرا سوال

باپ (بیٹے سے) "پرچہ کیسا ہوا ہے؟"

بیٹا: "بس پہلا سوال چھوٹ گیا۔"

باپ: "باقی سوال۔"

بیٹا: "تیسرا سوال مجھے آتا نہیں تھا، چوتھا میں کرنا بھول گیا، پانچواں مجھے نظر نہیں آیا، چھٹا پرچے کی پچھلی طرف تھا وہ میں نے دیکھا نہیں۔"

باپ (غصے سے) "اور دُوسرا سوال۔"

بیٹا: "بس دُوسرا سوال ہی غلط ہوا ہے" (حفیظ اللہ پشاور)

دوڑ دھوپ

ماں (بیٹے سے): "تم دھوپ میں کیوں دوڑ رہے ہو؟"

بیٹا: "امی جان! میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔" (سعد اللہ، حویلی لکھا)

WWW.PAKSOCIETY.COM

عیدِ قرباں

عیدِ قرباں آئی دیکھو، عیدِ قرباں آئی
پیارے بچو! رب کی رحمت سارے جہاں پر چھائی
سنو ذرا تم، حکمِ رب کو سچے دل سے مانو
اپنے رب کی رضا کی خاطر اپنی جان لٹا دو
بغض مٹا کر اپنے دل سے کام جہاں کے آؤ
قربانی کا جذبہ ہر اِک دل میں بڑھ کے جگاؤ
حضرت ابراہیمؑ کی سنت کو اپناؤ تم سب
وقت پڑے تو ملک و قوم کے کام بھی آؤ تم سب
مُفلس کے کام آنا بھی ہے دیکھو ایک عبادت
ان کی لینا خوب دُعائیں کر کے ان کی خدمت
سب کو تم ایثار سکھاؤ، گلے لگاؤ سب کو
آپس میں سب خوشیاں بانٹو، راضی رکھو رب کو
سب سے مل کر رہنا سیکھو، قتلِ عام کو روکو
دین سے ہٹ کر کام کرے جو بڑھ کے اُس کو ٹوکو

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہروپیا

محمد طارق سمرا

"لے جاؤ اس نالائق کو اور ہمیشہ کے لیے قید خانے میں ڈال دو۔ ہماری سلطنت میں ایسے بے کار لوگوں کی کوئی گنجائش نہیں۔" راجہ نے دھاڑتے ہوئے کہا تو نوریز تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر جونہی راجہ کے سپاہی اُسے گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھے، نوریز دوڑتا ہوا راجہ کے قدموں میں گر گیا اور چلانے لگا:

"رحم...... حضور...... رحم...... خاکسار کو ایک موقع اور دیا جائے۔ اگر اب بھی میں اپنے فن کی اہمیت ثابت نہ کرسکا اور اپنے فن کا لوہا نہ منوا سکا تو بے شک میرا سر تن سے جدا کردیا جائے۔"

نوریز کی بات سن کر راجہ کا غصہ قدرے کم ہوا اور وہ بولا: "ٹھیک ہے...... ہم تمہیں مہلت دینے کے لیے تیار ہیں...... بولو کتنی مہلت درکار ہے...... لیکن یاد رکھو اگر تم نے اپنا قول نبھائے بغیر ہماری سلطنت کی حدود سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی تو صرف تمہیں ہی نہیں تمہارے پورے خاندان کو پھانسی دے دی جائے گی۔"

"بہت بہت شکریہ سرکار...... مجھے صرف ایک سال کی مہلت درکار ہے......!" نوریز نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا تو راجہ نے سپاہیوں کو مخصوص اشارہ کردیا اور نوریز آداب بجالاتا ہوا راجہ کے دربار سے رخصت ہوگیا۔

نوریز پیشے کے اعتبار سے ایک بہروپیا تھا اور نسلاً ایرانی تھا۔ وہ اپنے پیٹ کی خاطر مختلف شہروں میں قیام کرتا تھا۔ مختلف طرح کے روپ بھرتا اور لوگوں سے داد وصول کر کے اگلے شہر کو چل دیتا۔ اُسے اپنے فن میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے فن کی بدولت بڑے بڑے نواب اور جاگیردار حیران رہ جاتے اور خوش ہو کر اس پر انعام و اکرام کی بارش کردیتے۔

یونہی شہر بہ شہر سفر کرتا ہوا نوریز چند ماہ پہلے ہی ریاست نواب پور میں داخل ہوا تھا۔ اس ریاست کا راجہ عجیب مزاج کا انسان تھا۔ وہ دل بہلانے والے علوم و فنون کے سخت خلاف تھا۔ اس نے پوری ریاست میں اعلان کروایا ہوا تھا کہ کوئی شخص ایسے علوم و فنون نہ سیکھے جو بے مقصد ہوں۔

نوریز کو راجہ کے اس اعلان کا علم ریاست میں داخل ہونے کے بعد ہوا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ وہاں سے کسی اور شہر کی طرف کوچ کرتا، اس کی اطلاع راجہ تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ راجہ کے حکم پر سپاہیوں نے اُسے گرفتار کر کے راجہ کے دربار میں پیش کردیا تھا۔

نوریز راجہ کے دربار سے مہلت لے کر واپس آیا تو کافی پریشان تھا۔ اُس نے جان بچانے کے لیے مہلت تو لے لی تھی لیکن اب پریشان تھا کہ اپنا قول کیسے نبھائے گا۔ کئی دن وہ اس مسئلہ پر سوچتا رہا بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اب اسے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ اس نے عارضی طور پر سوانگ رچانے والا کام ملتوی کردیا اور اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری تک محدود کرلیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ راجہ کے خاص ہرکارے اس کی مسلسل نگرانی کررہے ہیں۔ ایک ڈیڑھ ماہ اس نے یونہی گزار دیا۔ حتیٰ کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

نگرانی کرنے والے مطمئن ہو کر اپنے دیگر کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اور نوریز بھی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گیا۔

اسی طرح گیارہ ماہ گزر گئے۔ ایک دن راجہ کو اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ شہر کے دروازے کے پاس ایک فقیر نے ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ وہ بہت سحر انگیز شخصیت کا مالک ہے۔ جو شخص کچھ دیر اس کی صحبت میں بیٹھ جاتا ہے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ روز بروز اس کے عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب تو یہ عالم ہے کہ آدھے سے زیادہ شہر اس کا عقیدت مند بن چکا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ صرف چھ ماہ پہلے ہی منظر عام پر آیا تھا۔ اور چند ہی ماہ میں اُس نے لوگوں میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

راجہ نے فوراً اپنے وزیروں کا اجلاس بلوایا اور جاسوسوں کی اطلاع پر مشورہ طلب کیا۔

وزیر اعظم نے کہا: ''مجھے تو یہ بزرگ فراڈ لگتا ہے۔ کیوں کہ اتنے کم وقت میں اتنی مقبولیت حاصل کر لینا بچوں کا کھیل نہیں۔ یقیناً یہ بزرگ کے روپ میں کسی دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ اور لوگوں کو اپنا گرویدہ کر کے ہماری ریاست میں اپنی طاقت جمع کر رہا ہے۔ تاکہ موقع پا کر عوام کے ذریعے بغاوت کروا دے اور تخت پر قبضہ کر لے۔''

فوج کے سپہ سالار نے کہا: ''یہ صورت حال واقعی تشویش ناک ہے مہاراج حکم فرمائیں میں ابھی سپاہی بھیجتا ہوں جو اسے گرفتار کر کے مہاراج کے حضور پیش کر دیں گے۔ پھر خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

اسی طرح مختلف وزیر اپنی اپنی سوچ کے مطابق مشورہ دے رہے تھے۔ پھر راجہ نے ایک بوڑھے وزیر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جو تمام وزراء میں سب سے زیادہ عقل مند خیال کیا جاتا تھا۔ بوڑھے وزیر نے راجہ کی نگاہوں کا مطلب بھانپ لیا اور نہایت ادب کے ساتھ گویا ہوا:

''اب تک دربار میں میرے معزز دوستوں نے جو مشورے پیش کیے اگرچہ وہ بہت مخلصانہ ہیں، لیکن میرے خیال میں اس بزرگ کے خلاف طاقت کا استعمال کسی بھی طرح درست نہیں۔ لوگ اس بزرگ کے بہت زیادہ گرویدہ اور جانثار بن چکے ہیں۔ اس کی گرفتاری کی خبر سن کر عوام میں شدید غصہ پیدا ہو گا جو مہاراج کے خلاف بغاوت کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں احتیاط سے کام لینا ہو گا اور ایسی تدبیر کرنا ہو گی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''وزیر محترم آپ ہی بتایئے ہمیں اس صورت حال سے کیسے نپٹنا چاہیے......!'' راجہ نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی کیوں کہ بوڑھے وزیر کی بات دل کو لگنے والی تھی۔ راجہ کا اشارہ پا کر بوڑھا وزیر دوبارہ گویا ہوا۔

''مہاراج! اس بزرگ پر یہی شبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ دشمن ملک کا جاسوس ہے اور عوام میں اثر و رسوخ پیدا کر کے انہیں بغاوت پر آمادہ کرنا چاہتا ہے تاکہ تخت پر قابض ہو سکے۔ میری تجویز یہ ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ حضور خود اس بزرگ کی کٹیا میں تشریف لے جائیں اور یہ ظاہر کریں کہ آپ اس کی باتوں سے متاثر ہو گئے ہیں۔ پھر اسے نذرانہ کے طور پر ڈھیر سارا مال و دولت پیش کریں اور ساتھ ہی ساتھ اسے نائب وزیر اعظم بنانے کی پیشکش کریں۔ اگر وہ لالچی اور فراڈیا ہوگا تو مال و دولت پا کر خوش ہوگا اور فوراً عہدہ قبول کرلے گا۔ اور جب وہ دربار سے وابستہ ہوجائے گا تو رفتہ رفتہ اس کا عوام سے رابطہ کٹ جائے گا۔ تب حضور اس پر کوئی بھی الزام لگا کر گرفتار کرلیں گے۔ یوں دشمن بھی قابو میں آجائے گا اور بغاوت بھی نہیں پھوٹے گی۔" بوڑھے وزیر نے اپنی بات مکمل کی تو سب وزراء عش عش کرا ٹھے۔ راجہ کو بھی اس کی تجویز بہت پسند آئی تھی۔ یوں اگلے ہی روز اس تجویز پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

ڈوسرے روز راجہ کی شاہی سواری پوری شان و شوکت کے ساتھ نکلی۔ سپاہیوں کی کثیر تعداد کے علاوہ بہت سے غلام اور کنیزیں بھی ہمراہ تھیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے سروں پر بیش قیمت موتی اور جواہرات سے بھرے تھال اٹھائے ہوئے تھے۔ جب راجہ اپنے وزیروں کے ہمراہ بزرگ کی کٹیا تک پہنچا تو اُس نے حیران کن ماجرا دیکھا۔

ایک باریش اور سفید پوش بزرگ زمین پر چٹائی بچھائے بیٹھے ہیں اور ان کے اردگرد ہزاروں کی تعداد میں لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ سکوت کا یہ عالم ہے کہ اتنے بڑے مجمع کے باوجود بزرگ کی آواز ڈور سے ہی صاف سنائی دے رہی تھی۔

راجہ کے سپاہیوں نے مجمع میں سے راستہ بنایا اور راجہ اپنے محافظوں اور وزیروں کے ہمراہ بزرگ تک پہنچا۔ راجہ کو توقع تھی کہ وہ بزرگ کھڑے ہوکر اس کا استقبال کریں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ وہ بزرگ بیٹھے بیٹھے چٹائی پر ذرا سا سرک گئے تاکہ راجہ کے لیے بیٹھنے کی جگہ بن جائے۔

"حضور مجھے بھی کچھ نصیحت فرمایئے۔" منصوبے کے مطابق راجہ نے عرض کی تو بزرگ نے راجہ کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ڈنیا بنانے والے نے تمہیں اس چھوٹے سے خطے کا حکمران بنایا ہے۔ گویا عوام الناس کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار بنایا ہے۔ تمہیں چاہئے کہ اپنے فیصلے عدل و انصاف سے کرو اور رعایا کی خبر گیری رکھو۔ اور ظلم کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آؤ خواہ وہ کتنا ہی معزز اور کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو۔ تب عوام سکھ کا سانس لیں گے اور تمہیں اپنے دل میں بسا لیں گے پھر ڈنیا کی کوئی طاقت تم سے تمہارا تخت نہیں چھین سکتی۔"

راجہ بزرگ کی باتوں سے واقعی بڑا متاثر ہوا اور پھر زر و جواہرات کے تھال نذرانے کے طور پر پیش کیے۔ جسے بزرگ نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہم خاک نشینوں کو اس کی حاجت نہیں۔ تب راجہ نے انہیں نائب وزیر اعظم کے عہدے کی پیش کش کی۔ بزرگ نے اس پیشکش کو بھی یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ انسان کا اصل منصب اپنے رب کا فرمانبردار بندہ بننا اور صرف اسی کی اطاعت کرنا ہے نہ کہ ڈوسروں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنانا۔ الغرض راجہ کو وہاں سے نامراد واپس آنا پڑا۔ بزرگ کی باتوں نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ اور اس کی اتنی بڑی پیش کش قبول نہ کر کے اُسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ وہ کئی دن سوچ بچار میں مصروف رہا لیکن کوئی فیصلہ نہ کرپایا حتی کہ ایک دن جاسوسوں نے اطلاع دی کہ وہ بزرگ اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر یوں غائب ہوگئے ہیں کہ کہیں ان کا سراغ نہیں مل رہا۔ راجہ کے لیے یہ اطلاع اور زیادہ حیرت انگیز تھی تاہم ایک طرح سے اطمینان بخش بھی تھی کہ بغاوت کا خدشہ عارضی طور پر ہی سہی، بہرحال ٹل گیا تھا۔

چند روز بعد راجہ کو اچانک اس بہروپیے کا خیال آیا۔ اس نے فوراً اپنے سپاہیوں کو بھیجا کہ نوریز نامی بہروپیے کو پکڑ کر ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہیوں نے آکر بتایا کہ نوریز بھی اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر غائب ہو چکا ہے۔ راجہ نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ نہ صرف پوری ریاست میں پھیل جائیں بلکہ آس پاس کی ریاستوں میں تلاش کریں اور جیسے بھی ہو اس مفرور کو گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔

مزید چند روز گزرے ہوں گے کہ ایک دن جب راجہ دربار سجائے بیٹھا تھا اور لوگوں کے مقدمات سن رہا تھا کہ دربار میں ہلچل مچ گئی۔ کسی نے خبر دی کہ وہ بزرگ اچانک دوبارہ نمودار ہوگئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں اور دربار کی طرف آ رہے ہیں۔ اور لوگوں کا ایک ہجوم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ یہ خبر راجہ پر بجلی بن کر گری۔ دیگر وزراء پر بھی سکتہ طاری ہوگیا۔ اور انہیں یقین ہوگیا کہ اب راجہ سے اس کا تخت چھننے ہی والا ہے۔

اسی اثناء میں بزرگ دربار کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے لوگوں کو ہاتھ کے اشارہ سے باہر ہی روک دیا اور خود اکیلے ہی اندر داخل ہوئے اور جھک کر راجہ کو آداب کیا۔ راجہ پر پے در پے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

تب بزرگ نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''حضور مجھے پہچانئے! میں آپ کا خادم نوریز بہروپیا ہوں......!'' یہ کہہ کر بزرگ اپنا بہروپ اتارنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک بالکل مختلف چہرہ نظر آنے لگا جسے سب پہچانتے تھے۔ وہ واقعی نوریز تھا۔

تمام اہل دربار مارے حیرت اور خوشی کے تالیاں بجانے لگے۔ راجہ کی بھی جان میں جان آئی۔ اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''نوریز تم نے تو کمال کردیا۔ اتنے لوگوں میں سے کوئی بھی تمہیں نہیں پہچان سکا۔ واقعی تم اپنے فن میں باکمال ہو۔''

''تو پھر حضور لائیے میرا انعام......!'' نوریز نے چہکتے ہوئے کہا۔

''انعام تو ہم تمہیں دیں گے، لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب ہم خود چل کر تمہارے پاس آئے تھے اور ڈھیروں جواہرات اور مال و زر کے علاوہ عہدہ کی پیش کش کی تھی جب تو تم نے یہ سب کچھ سختی سے ٹھکرا دیا تھا، لیکن اب اس مال و دولت کی تمنا کر رہے ہو......!'' راجہ نے حیرت سے پوچھا۔ تب نوریز نے کہا۔

''حضور میں ایک فن کار ہوں۔ کوئی بھی سچا فن کار اپنے فن کی حرمت کو پامال نہیں کرتا۔ اس وقت میں اللہ والے کے روپ میں تھا اور اللہ والوں کو دُنیاوی مال و زر کی ہوس نہیں ہوتی۔ اگر میں اس وقت کچھ نذرانہ وغیرہ قبول کرلیتا تو اللہ والوں کی حرمت پر فرق آتا اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا اس لیے میں نے اس وقت انکار کردیا تھا۔''

راجہ کو نوریز کا جواب سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے نہ صرف نوریز کو بہت سا انعام و اکرام دیا بلکہ بوڑھے وزیر کے مشورے پر اپنے ہاں شاہی ملازم بھی رکھ لیا۔ تاکہ وہ سرکاری جاسوسوں کو دشمن ملک میں اپنی اصلیت چھپانے کے لیے روپ بدلنے کا فن سکھا سکے۔

(مرکزی خیال ماخوذ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

میری زندگی کے مقاصد

محمد حذیفہ انور، جھنگ صدر
میں سافٹ ویئر انجینئر بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

امان الٰہی خان، فیصل آباد
میں بڑا ہو کر پائلٹ بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

احمد فاروق، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

عبدالقدیر، ملتان
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

ایمان کامران، راولپنڈی
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

عبدالرحمٰن، راولپنڈی
میں کرکٹر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

صدیقہ ناز، نوشہرہ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

اسامہ [illegible]، کراچی
میں پولیس افسر بن کر جرائم کا خاتمہ کروں گا۔

عائشہ بتول، مظفر گڑھ
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

میاں نعیم طفیل، لاہور
ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔

محمد ذیشان راجہ، راولپنڈی
میں آرمی میں جا کر اپنے والدین کا نام روشن کرنا چاہتا ہوں۔

محمد آصف، جہلم
میں آرمی میں جا کر ارضِ پاک کی حفاظت کروں گا۔

اسد علی، راولپنڈی
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

فریال، فیصل آباد
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

عبداللہ محمود، لاہور
میں انجینئر بن کر اپنے والدین اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

حسن علی خان، ڈیرہ اسماعیل خان
میں بڑا ہو کر عبدالستار ایدھی کی طرح لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد نعمان شہباز، گوجرانوالہ
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک و قوم کا نام روشن کرنا چاہتا ہوں۔

سمیہ خاور، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

فاطمہ رحمٰن، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

محمد حذیفہ علی، ملتان
میں حافظِ قرآن بنوں گا اور قرآنی تعلیمات پر عمل کروں گا۔

میر جواد، اسلام آباد
میں ڈاکٹر بن کر غریب لوگوں کا مفت علاج کروں گی۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پر کر کے اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام .... شہر ....

مقاصد ....

....

WWW.PAKSOCIETY.COM

مختصر مختصر

ذہانت

ایک مرتبہ تین آدمی سترہ اونٹ لے کر حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: آپؓ ان اونٹوں کو اس طرح تقسیم کر دیں کہ ایک کو ان اونٹوں کا نصف حصہ، دُوسرے کو تیسرا حصہ اور تیسرے آدمی کو ان اونٹوں کا نواں حصہ ملے، لیکن ان میں سے کوئی اونٹ نہ تو فروخت کیا جائے اور نہ ہی کسی اونٹ کو دو حصوں میں کاٹا جائے۔

آپؓ نے اس کا فیصلہ کچھ یوں کیا کہ سب سے پہلے ان اونٹوں میں آپؓ نے ایک اونٹ کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ یوں اونٹوں کی کل تعداد اٹھارہ ہوگئی۔ آپؓ نے پہلے آدمی کو نصف یعنی نو اونٹ دیے اور نو اونٹ باقی بچ گئے۔ پھر دُوسرے کو تیسرا حصہ یعنی چھے اونٹ دیے اور باقی تین اونٹ رہ گئے۔ اب تیسرے شخص کو اونٹوں کا نواں حصہ یعنی دو اونٹ دیے اور باقی ایک اونٹ بچ گیا جو کہ حضرت علیؓ کا تھا۔

(حافظ فرخ حیات، پیر محل)

دیناروں کی تھیلی

کسی شخص کی ایک مرتبہ دیناروں کی تھیلی کھو گئی تو اُس نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پر الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ میری تھیلی آپؓ نے ہی چرائی ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؓ نے اس سے سوال کیا کہ اس میں کتنی رقم تھی؟ اس نے کہا دو ہزار دینار۔ چنانچہ گھر لے جا کر آپؓ نے اس کو دو ہزار دینار دے دیے۔ بعد میں جب اس کی کھوئی ہوئی تھیلی کسی دُوسری جگہ سے مل گئی تو اس نے پورا واقعہ بیان کر کے معافی چاہتے ہوئے آپؓ سے رقم واپس لینے کی درخواست کی، لیکن آپؓ نے فرمایا کہ ہم کسی کو دے کر واپس نہیں لیتے۔ پھر جب لوگوں سے اس کو آپؓ کا اسمِ گرامی معلوم ہوا تو اُس نے بے حد ندامت کا اظہار کیا۔

(حسن رضا، سردار، کاموکی)

دلیہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز بڑے جلیل القدر اور انصاف پسند خلیفہ تھے۔ ایک بار آپ کو اطلاع ملی کہ سپہ سالار کے باورچی خانے کا روزانہ کا خرچ ہزار درہم ہے تو آپ کو بہت رنج ہوا کہ جس دولت پر غریب رعایا کا حق ہے، اُسے خلیفہ کا سپہ سالار اس طرح لٹا رہا ہے۔ انہوں نے سپہ سالار کو دعوت پر بلایا۔

دُوسرے دن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ خوب لذیذ کھانے بناؤ اور ساتھ جو کا دلیہ بھی بناؤ۔ سپہ سالار آیا تو آپ نے اس کے ساتھ گفتگو شروع کر دی حتیٰ کہ وہ بھوک سے بے حال ہوگیا۔ آپ نے یہ دیکھ کر ملازم کو کہا میرا کھانا لاؤ۔ کچھ دیر بعد ملازم نے دلیہ لا کر رکھ دیا۔ سپہ سالار نے جب دلیہ دیکھا تو اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ خلیفہ نے کہا: ''دلیہ کھانا شروع کرو۔'' اس نے فوراً دلیہ کھانا شروع کر دیا۔ پھر خلیفہ نے ملازم سے کہا: ''مہمان کا کھانا لاؤ۔'' کچھ دیر بعد ملازم کھانا لے آیا۔ پھر انہوں نے سپہ سالار کو مخاطب کیا: ''دلیہ تو میرے لیے تھا، آپ یہ کھائیے۔'' سپہ سالار بولا: ''میرا پیٹ تو دلیے سے ہی بھر گیا ہے، میں اور نہیں کھا سکتا۔'' یہ سن کر خلیفہ بولے: ''دلیے پر بمشکل ایک درہم خرچ ہوا، جب کہ آپ ہزاروں درہم کھانے پر خرچ کرتے ہیں، لیکن پیٹ تو اسی سے بھر جاتا ہے۔ یہ بات سن کر سپہ سالار شرمندہ ہوگیا اور توبہ کی کہ آئندہ سادہ زندگی گزارے گا۔

(علی شہروز، فیصل آباد)

ایک جملہ

یہ پہلی جنگِ عظیم کا واقعہ ہے۔ لڑائی کے دوران ایک سپاہی نے اپنے جگری دوست کو گرتے دیکھا تو خوف زدہ ہوگیا۔ وہ اس وقت ایک مورچے میں تھا۔ اور سنسناتی گولیوں کی بوچھاڑ مسلسل اس کے سر سے گزر رہی تھی۔ سپاہی نے اپنے افسر سے پوچھا کہ کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ مورچے سے باہر جا کر خندقوں کے درمیان اپنے گرے ہوئے ساتھی کو اٹھا کر لے آئے۔ ”تم جا سکتے ہو۔“ افسر نے کہا، ”لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس ایثار سے تمہیں کچھ حاصل ہو گا۔ تمہارا دوست غالباً مر چکا ہے اور تم بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتے ہو۔“

پھر وہ سپاہی مورچے سے نکل گیا۔ معجزاتی طور پر وہ اپنے دوست تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دوست کو شانوں پر اٹھایا۔ اور گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرتا ہوا اُسے واپس اپنی کمپنی کے مورچے میں لے آیا۔ جب وہ گرتا پڑتا مورچے کے نشیب میں پہنچا تو افسر نے زخمی سپاہی کا معائنہ کیا۔ اور پھر ہمدردی سے اس سپاہی کی طرف دیکھا جسے اُس کا دوست جان ہتھیلی پر رکھ کر اٹھا کر لایا تھا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اس جاں بازی سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا، تمہارا دوست مر چکا ہے۔ اور تم بھی زخمی ہو۔“ افسر نے کہا۔

”جناب! اس کے باوجود بھی میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔“ سپاہی نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ افسر نے پوچھا۔

”میرا دوست تو مر چکا ہے، لیکن میری محنت کا پھل مجھے مل گیا۔ کیوں کہ جب میں اُس کے پاس پہنچا تو اُس وقت تک وہ زندہ تھا۔ اُس کے منہ سے ایک جملہ سن کر مجھے جو تسکین ملی ہے۔ آپ اُس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس نے کہا تھا،

”جم! میں جانتا تھا، تم ضرور آؤ گے۔“

(کامران زیب مروت، پشاور)

مہنگائی

کسی شہر میں ایک مزدور رہتا تھا۔ اُس کی ایک بیٹی تھی۔ مزدور بہت محنتی اور خوش اخلاق تھا۔ سارے محلے والے اس مزدور سے خوش تھے۔ اس کا نام اکرم تھا۔ اس کے پاس ایک صندوق تھا۔ وہ اس صندوق کو بہت حفاظت سے رکھتا تھا۔ محلے والوں نے سوچا کہ اس صندوق کا راز معلوم کرنا چاہیے، لیکن وہ کوشش کے باوجود صندوق کا راز معلوم نہ کر سکے۔ جب اکرم کی موت کا وقت قریب آیا تو اُس نے مرنے سے پہلے سارے محلے والوں کو بلایا اور کہا کہ آپ لوگوں نے کئی بار اس صندوق کا راز معلوم کرنا چاہا مگر میں نے آپ لوگوں کو اس کا راز نہیں بتایا۔ اب میں اس صندوق کو آپ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ اس میں ایک ایسی چیز ہے جو برسوں سے چلی آ رہی ہے اور مسلسل بڑھ رہی ہے۔ میں بھی اس کے خلاف جنگ کرتا رہا ہوں، مگر یہ ختم نہیں ہوئی۔ اب میں یہ آپ کو دے کر جا رہا ہوں کہ آپ بھی اس کے خلاف جنگ کریں تا کہ یہ جلد از جلد ختم ہو جائے۔ یہ کہنے کے بعد اکرم فوت ہو گیا۔ محلے والے سمجھے کہ اس صندوق میں کوئی خوف ناک چیز ہو گی۔ محلے والوں نے اپنے اپنے ہتھیار اٹھا لیے۔ اب ایک آدمی نے آگے بڑھ کر صندوق کھولا۔ محلے کا ہر آدمی تیار کھڑا تھا کہ جیسے ہی صندوق میں سے کوئی چیز نکلے گی ہم اُسے مار ڈالیں گے، لیکن جب صندوق کھلا تو اندر سے کوئی چیز نہ نکلی تو ایک آدمی نے آگے بڑھ کر صندوق میں جھانک کر دیکھا۔ اندر کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر صندوق کے کونے میں ایک پرچی پر اُس کی نظر پڑی۔ اس نے پرچی اٹھا کر دیکھی تو اس پر لکھا تھا۔ ”مہنگائی۔“

(لائبہ خالد، لاہور)

رہائی

کسی بادشاہ نے ایک بے گناہ شخص کو قتل کر دینے کا حکم جاری کیا۔ اس پر اس شخص نے بادشاہ سے درخواست کی کہ آپ جس غصے اور غضب کی بنا پر مجھے قتل کروا رہے ہیں اس سے دراصل آپ اپنے لیے ہمیشہ کی تکلیف کا سامان کر رہے ہیں۔ مجھ پر میرے قتل کی مصیبت تو لمحہ بھر میں ختم ہو جائے گی، لیکن آپ پر میرے قتل کا گناہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس شخص کی ان باتوں سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اُس نے اُسے آزاد کر دیا۔

(عائشہ ادریس، علی پور)

انمول بات

اپنی سوچوں کو پانی کے قطروں کی طرح شفاف رکھو کیوں کہ جس طرح قطروں سے دریا بنتا ہے اسی طرح سوچوں سے ایمان بنتا ہے۔

(شہریز الرحمن، بہاول پور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

سنہرے لوگ

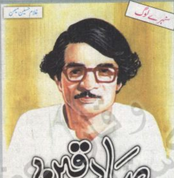

صادقین

قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں میں امروہہ سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان مصور بھی تھا۔ اُس نے ہجرت سے قبل کچھ عرصہ کے لیے امروہہ کے قدیم ''امام المدارس سکول'' کے بچوں کو مصوری کی تعلیم دی تھی۔ جب وہ نوجوان پاکستان آیا تو یہاں روزگار کی تلاش میں اُسے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کراچی کے جس علاقے میں اس کی رہائش تھی، وہاں ٹیڑھے میڑھے خاردار اور بدشکل پودوں کی کثرت تھی۔ ان پودوں پر سردی گرمی کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ عرف عام میں ایسے پودوں کو کیکٹس کہا جاتا ہے۔ وہ اکثر آتے جاتے ان پودوں کو دیکھا کرتا۔ بعد میں اُس نے اس پودے کو اپنی مصوری کا حصہ بنایا۔

سفید کرتہ پاجامہ اور کبھی کبھار شیروانی زیب تن کیے یہ خوش مزاج اور خوش وضع انسان کوئی اور نہیں، مصوری میں پاکستان کو شناخت دلانے والے بین الاقوامی مصور ''صادقین'' تھے۔ ان کا مکمل نام صادقین احمد نقوی تھا۔ آپ 30 جون 1930ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ سے اور بی اے آگرہ یونی ورسٹی سے کیا۔

پاکستان آ کر انہوں نے کچھ عرصے ریڈیو پاکستان کراچی میں بہ طور اسسٹنٹ پروگرام، کام کیا۔ مصوری کے شعبے میں ان کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ایک سرکاری محکمے نے گڈانی کے ساحل پر رہائش فراہم کی تا کہ وہ اپنا مصورانہ کام سکون کے ساتھ انجام دے سکیں۔ وہ خاصے عرصے یہاں رہ کر تصویریں بناتے رہے۔ اس دور میں ان کا موضوع بلوچ خواتین اور کیکٹس پودا تھا۔ ان تصاویر کی نمائش 1954ء میں کوئٹہ میں ہوئی۔ انہوں نے بہت جلد خطاطی اور مصوری، میں اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا۔ ان کی شہرت کا اصل آغاز دیوار گیر تصاویر جسے انگریزی میں میورل (Mural) کہا جاتا ہے سے ہوا۔ پہلا میورل انہوں نے کراچی ایئر پورٹ پر بنایا، پھر سینٹرل ایکسائز لینڈ، کمشنر کلب اور سروسز کلب کی دیواریں بھی مزین کیں۔ 1961ء میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کراچی کی لائبریری میں بھی عظیم الشان میورل بنایا جسے انہوں نے ''وقت کا خزانہ'' کا نام دیا۔ اسی میورل میں انہوں نے سقراط سے آئن اسٹائن تک ہر عہد کے سائنسی ارتقاء کا اظہار مصوری میں کیا۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ منگلا ڈیم کے بجلی گھر میں ''رزمیہ محنت'' کے عنوان سے ایک بڑی اور عظیم الشان تصویر ہے جو محنت کی عظمت اور اُس کے تاریخی سفر کو ظاہر کرتی ہے۔

اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے وہ پیرس چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے اپنے فن کے یادگار نمونے پیش کیے اور کئی بین الاقوامی نمائشوں میں ایوارڈ، انعامات اور اعزازات حاصل کر کے پاکستان کا نام روشن کیا۔ اُن کے شاہکار "The Last Supper" نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ فرانس کے بعد وہ کچھ عرصے امریکا میں بھی رہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

صادقین کی فن کارانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں انہیں تمغۂ امتیاز دیا گیا۔ 1962ء میں اُن کے حصے میں تمغۂ حسن کارکردگی آیا۔ 1965ء کی جنگ ستمبر کے بعد انہوں نے ''شہید'' اور ''جنگ'' کے عنوانات سے دیوار گیر تصاویر بنا کر ان واقعات کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ 1990ء میں انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔

1969ء میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انہوں نے منتخب کلامِ غالبؔ کو بڑی خوب صورتی سے مصور کیا اور تقریباً پچاس بڑی تصاویر تخلیق کیں۔ علامہ اقبال اور فیض احمد فیض بھی ان کے محبوب شعراء تھے۔ صادقین نے اُن کے کلام کو بھی مصور کر کے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

ابھی تک وہ اپنی مصوری کا اظہار بُرش سے کر رہے تھے، مگر 1970ء میں انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ''مصورانہ خطاطی'' کا آغاز کیا۔ انہوں نے قرآن مجید کی آیات کو ایک مخصوص انداز میں مصور کیا جس میں ہر حرف اپنی جگہ مکمل رہتے ہوئے بھی اگلے حرف سے ملتا ہے۔ اس فن میں اُن کا بہترین نمونہ ''سورۃ الرحمٰن'' کی خطاطی ہے جس کی آیات مبارکہ کو صادقین نے ان کے معنی سے ہم آہنگ کر کے اس طرح مصور کیا ہے کہ ہر آیت میں چھپے ہوئے معنی تصاویر کی شکل میں دیکھنے والوں پر آشکار ہو جاتے ہیں۔

1972ء میں انہوں نے سورۃ یٰسین کو 260 فٹ طویل پینل پر تحریر کیا اور یہ پینل لاہور کے عجائب گھر کو دے دیا۔ بعد ازاں اس عجائب گھر کو انہوں نے مصوری سے بھی سجایا۔ صادقین نے پنجاب پبلک لائبریری کے دارالقرآن کو آیاتِ قرآنی کی دل نشین اور پاکیزہ خطاطی سے سجایا۔

صادقین 80ء کے عشرے میں بھارت گئے تو وہاں بھی علی گڑھ یونی ورسٹی، اُردو گھر حیدرآباد دکن، ہندو یونی ورسٹی بنارس، ایوان غالب دہلی اور ہمدرد مرکز دہلی میں اپنے فن کے نقوش بہ طور یادگار چھوڑے۔ دہلی میں اُن کے کام کی نمائش ہوئی۔ سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر انہوں نے حاضری دی اور اپنے فن پاروں کی صورت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اسی دورے کے دوران بھارتی حکومت نے امروہہ میں اُن کا ذاتی مکان، جو متروکہ املاک بورڈ کی تحویل میں تھا، صادقین کو بہ طور تحفہ پیش کیا۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ یہ مکان اس خواہش کے ساتھ اہل امروہہ کو پیش کر دیا کہ یہاں ایک کتب خانہ قائم کر دیا جائے۔

انہوں نے لیاقت ہال لائبریری کی چھت کے لیے ''انسان اور کائنات'' کے عنوان سے میورل تیار کیا۔ اپنے انتقال سے قبل وہ جناح ہال کراچی کو اپنی تصاویر سے آراستہ کر رہے تھے، جس کا بنیادی موضوع ''الارض و السماء'' تھا۔ وہ یہ کام مکمل کیے بغیر ہی 10 فروری 1987ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

پیرس کی ایک نقاد نے صادقین کے بارے میں کہا تھا کہ اُن کا فن مشرق اور مغرب کا خوب صورت امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی کاموں سے اپنی زندگی کا قرض بخوبی چکا دیا ہے۔

صادقین خطاط اور مصور کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ غزلیں، نظمیں اور قطعات کی شکل میں اُن کا کلام موجود ہے۔ رُباعی ان کی پسندیدہ صنف تھی۔ وہ بین الاقوامی طور پر پہچانے جانے والے بڑے مصور تھے، مگر اُن میں غرور و تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ سادہ اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کے نام سے کراچی میں ایک گیلری اور فاؤنڈیشن بھی ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھیل دس منٹ کا

ٹ	خ	ف	ش	ط	س	ن	و	ک	ر
ی	د	ٹ	غ	گ	ڈ	ن	ع	ح	ن
ب	ی	ب	س	و	ش	ط	ر	ن	ج
ل	ز	ا	ب	ی	ڈ	م	ن	ٹ	ن
ٹ	ا	ل	ت	ا	غ	ل	ا	س	م
ی	ب	ل	ا	ب	ٹ	ک	س	ا	ب
ن	ہ	و	ج	ن	ٹ	ہ	ا	ک	ی
س	ز	ل	ی	ب	ک	چ	آ	گ	د
م	ی	و	ح	ر	ر	ف	ر	ا	ب
ی	ن	پ	ث	ن	ک	ح	ت	م	ر

آپ نے حروف ملا کر دس کھیلوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن کھیلوں کے ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، باسکٹ بال، نیزہ بازی، پولو، سنوکر، شطرنج، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھیل اور کھلاڑی

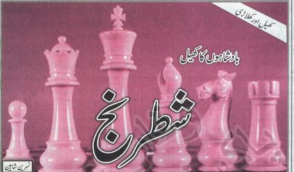

شطرنج

بادشاہوں کا کھیل

نسرین شاہین

شطرنج ایک قدیم کھیل ہے، یہ ہر دور میں لوگوں کی تفریح کا ذریعہ رہا ہے۔ یہ ایک بہت عمدہ اور دل چسپ کھیل ہے اور ذہنی قوت کے لیے اس سے بہتر کوئی کھیل نہیں۔ شطرنج کا کھیل نوابوں اور بادشاہوں کے درباروں میں تو اتنی مقبولیت حاصل کر چکا تھا کہ بعض مرتبہ شطرنج کے مقابلوں میں سلطنت بھی داؤ پر لگا دی جاتی تھی۔ کیوں کہ یہ ایک فوجی طرز کا کھیل ہے اور ایک زمانے میں اسے صرف بادشاہوں اور شاہی خاندانوں کا پسندیدہ کھیل سمجھا جاتا تھا۔ آج تک لوگ اس کو نوابوں اور بادشاہوں کا کھیل کہہ کر پکارتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق مغلیہ دورِ حکومت میں تو یہاں تک ہو چکا ہے کہ شیش محل میں بہت بڑی بساط بنا کر بے جان مہروں کی جگہ جان دار اور اصلی غلام و کنیزیں کھڑی کر کے شہزادوں نے شطرنج کھیلنے کا شوق پورا کیا۔ شطرنج ایک دل چسپ کھیل ہے جس میں دیکھا جائے تو ایک جنگی میدان میں دو مختلف ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں اور ان فوجوں کا کام اپنے اپنے بادشاہ کو مات ہونے سے بچانا ہوتا ہے، کیوں کہ بادشاہ کی مات کا مطلب اس ملک کی شکست سمجھا جاتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بادشاہ اور وزیر کے ہمراہ فوج میں پیادے (پیدل فوجی یا سپاہی) گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ شامل ہوتے ہیں جو اپنی حکمت عملی سے شکست سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کھیل ایک طرح سے پرانے زمانے میں لڑی جانے والی جنگوں سے متاثر ہو کر بنایا گیا ہے۔ جسے کھیلنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا میدان جنگ میں کوئی جنگ لڑی جا رہی ہو اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا فوجیں مخالف فریق پر فتح حاصل کرنے کے لیے بھرپور حکمت عملی کے ساتھ مصروف عمل ہوں۔

شطرنج کے کھیل میں فاتح وہ قرار پاتا ہے جو مخالف کھلاڑی کی فوج کو اپنی شاطرانہ چالوں سے پسپا کرتا ہوا اس کے بادشاہ کو چاروں طرف سے اس طرح محصور کر دیتا ہے کہ بادشاہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ شطرنج کے کھیل میں مخالف بادشاہ کو مات دینا ہی مقابلہ جیتنے کی علامت ہوتی ہے جس کے بعد فاتح کھلاڑی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر پوری فوج ماری جائے، لیکن بادشاہ نہ مارا جائے تو شکست نہیں ہو گی۔ شطرنج دو کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جانے والا ایسا کھیل ہے جسے شطرنج کی بساط پر کھیلا جاتا ہے، اس کھیل کی بساط 8x8 سائز کے ایک لکڑی یا موٹے گتے سے بنے ہوئے ایسے چوکور تختے پر سجائی جاتی ہے جس میں 64 چوکور خانے سفید اور کالے رنگوں میں ترتیب کے ساتھ بنے ہوتے ہیں۔ ہر کھلاڑی اس کھیل کا آغاز پلاسٹک کے بنے ہوئے 16 ٹکڑوں جنھیں مہرے کہا جاتا ہے، سے کرتا ہے، ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھلاڑی کے 16 مہرے کالے جب کہ دوسرے کھلاڑی کے 16 مہرے سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر کھلاڑی کے پاس ایک بادشاہ، ایک ملکی، دو گھوڑے، دو اونٹ، دو ہاتھی اور آٹھ پیادے یعنی سپاہی شامل ہوتے ہیں۔ جس مہرے کو باہر کے ملکوں میں کوئین یا ملکہ کہا جاتا ہے ہمارے یہاں اُسی مہرے کو عام طور پر وزیر کا نام دیا جاتا ہے۔

شطرنج کے کھیل میں 16 مہروں کی نقل و حرکت کے بھی کچھ قوانین بنائے گئے ہیں جن کے مطابق شطرنج کا کھلاڑی ان مہروں کو حرکت میں لا کر چالیں چلتا ہے۔ شطرنج کے بادشاہ، ملک یا وزیر اپنی مخصوص چال کے مطابق حرکت کا اپنا دائرہ ہوتا ہے اور گھوڑا، ہاتھی اور اونٹ کی چالوں کی بھی اپنی حدود ہیں جن کی پابندی کرتے ہوئے شطرنج کے کھلاڑی ان تمام مہروں کو حرکت میں لا کر اس کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ ایک بہترین دماغی کھیل ہے جس میں وہی کھلاڑی کامیاب رہتا ہے جو اپنی دماغی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے شاطرانہ چالیں چل کر مدِمقابل کھلاڑی کو شکست سے دو چار کر دیتا ہے۔ یہ دراصل دو انسانی دماغوں کے درمیان لڑی جانے والی ایک جنگ ہوتی ہے جو شطرنج کی بساط پر لڑی جاتی ہے۔ 4 خانوں کے اس کھیل میں دونوں طرف کے مجموعی طور پر 32 کھلاڑی میدان جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ اس کھیل کا مرکزی نکتہ مدِمقابل کھلاڑی کی 16 رکنی ٹیم کے بادشاہ کو شکست دینا ہوتا ہے۔ بادشاہ ہر وقت خطرے کی حالت میں ہوتا ہے اور مخالف کھلاڑی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مدِمقابل بادشاہ کو اپنے سولہ مہروں کی ماہرانہ نقل و حرکت سے اس طرح بے دست و پا کر دے کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکے اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو بادشاہ کوئی چال چلنے کے قابل نہیں رہتا اور یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ کھیل بہت طویل ہو جاتا ہے۔

شطرنج کے کھیل کی ایجاد کا سہرا ماہر ریاضی دان ''سیس سا بن داہر'' جس کا تعلق قدیم ہندوستان سے تھا کے سر باندھا جاتا ہے۔ یورپ میں یہ کھیل 15 ویں صدی کے وسط میں رائج ہوا اور اس قدیم کھیل کو وہاں Game Chess کے نام سے شہرت حاصل ہوئی، لیکن وہاں شطرنج کے آغاز سے قبل اسی کھیل کے اصول بنانے والوں نے اس کھیل کی حکمت عملی، طریقہ کار اور استادانہ چالوں میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کرنے کے بعد اسے موجودہ شکل میں متعارف کرایا۔ اس کھیل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کمپیوٹر کو بھی اس کھیل کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور شطرنج کھیلنے کے نت نئے پروگرام اور مشینیں منظر عام پر آئیں جن سے جدید شطرنج کو رواج ملا اور بات یہاں تک جا پہنچی کہ Deep Blue نام کی ایک مشین نے شطرنج کے مقابلوں میں فتح حاصل کرنے والے ایک ورلڈ چیمپئن Garry Kasparov کو 1997ء میں ہونے والے ایک مقابلے میں شکست سے دو چار کر کے شطرنج کے کھیل کا روایتی تصور ہی بدل ڈالا۔ باقاعدہ منظم انداز میں شطرنج کے مقابلے 16 ویں صدی کے دوران ترتیب دیئے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ شطرنج کے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھلاڑی Wilhelm Steinitz نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ 1886ء میں ہونے والے شطرنج کے پہلے بین الاقوامی سرکاری مقابلوں میں فتح حاصل کرنے والا دُنیا کا پہلا ورلڈ چیمپئن ہے۔

انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی نے بھی شطرنج کو ایک تسلیم شدہ کھیل کا درجہ دے رکھا ہے اور اب شطرنج کے بین الاقوامی مقابلے FIDE کے منظور شدہ قوانین کے تحت منعقد ہوتے ہیں۔ شطرنج کے کھیل کی کچھ اقسام بھی ہیں جو کافی مقبول ہیں جیسے Fast Chess اور Chomputer Chess وغیرہ۔

ان اقسام میں بہت فرق پایا جاتا ہے اور ان میں سے ہر قسم کے اپنے قوانین ہیں۔ تمام تر تبدیلیوں کے باوجود شطرنج کی یہ تمام اقسام اس کھیل کے شائقین میں پسند کی جاتی ہیں اور اب یہ کھیل آن لائن بھی کھیلا جاتا ہے جن میں دُنیا بھر سے شطرنج کے کھلاڑیوں کے مختلف گروپ حصہ لیتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے کمپیوٹر استعمال کر کے کھیلے جانے والے ان بین الاقوامی مقابلوں کو بہت تیزی سے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ پاکستان میں بھی بہت سے لوگ ان مقابلوں میں آن لائن حصہ لیتے ہیں۔ کئی پاکستانی نوجوان تو شطرنج کے کھیل میں بہت سے منفرد ریکارڈ بھی قائم کر چکے ہیں۔

پاکستان میں شطرنج کی فیڈریشن کا قیام 1970ء میں عمل میں آیا۔ ظہیر فاروقی کو 1970ء میں ہونے والی پہلی قومی چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز حاصل ہے انہوں نے چار مرتبہ قومی ٹائٹل حاصل کیا۔ سب سے زیادہ قومی چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز چیمپئن محمود احمد خان لودھی کو حاصل ہے۔ یہ پاکستان میں شطرنج کے سب سے بڑے کھلاڑی ہیں اور اس کھیل کے ماہر استاد ہیں۔ گوجرانوالہ میں پیدا ہونے والے محمود احمد لودھی جو پاکستان کی جانب سے بارہ مرتبہ شطرنج کے قومی چیمپئن رہ چکے ہیں۔ انہیں تہران میں ہونے والے شطرنج کے انٹرنیشنل الفجر انٹرنیشنل ٹورنامنٹ میں حصہ لینے کی باقاعدہ دعوت دی گئی جس میں انہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ یہ نہ صرف محمود احمد لودھی کے لیے بلکہ پاکستان کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ شطرنج میں نمایاں کارکردگی اور خدمات کی وجہ سے محمود لودھی کو Parco کی جانب سے دماغی کھیلوں کا Parco Ambassador بھی مقرر کیا گیا تھا۔

شطرنج کے آٹھ روزہ بین الاقوامی مقابلوں میں مرکزی ایشیائی جمہوری ممالک، روس، مڈل ایسٹ اور دیگر ملکوں کے کھلاڑی باقاعدہ حصہ لیتے ہیں۔ شطرنج کے الفجر انٹرنیشنل مقابلے میں حصہ لینے کے بعد محمود احمد لودھی دبئی اور سربیا میں ہونے والے شطرنج کے مرکزی مقابلوں میں بھی شریک ہوئے۔ پاکستان میں مائنڈ اسپورٹس ایسوسی ایشنز آف پاکستان اور پاک عرب ریفائنری کمپنی شطرنج کے بین الاقوامی مقابلوں میں ان کو مالی تعاون فراہم کرتی ہے۔ محمود احمد لودھی مسلسل اور یکساں کارکردگی کا مظاہرہ کر کے اپنی Fide ریٹنگ کو 2400 تک لے گئے جو شطرنج کے تاریخ میں کسی بھی پاکستانی کھلاڑی کی سب سے بہترین کارکردگی ہے۔

یوں تو شطرنج کو پاکستان میں شروع ہی سے مقبولیت حاصل ہے، لیکن جب اس کے بڑے بڑے انعامی مقابلوں کا آغاز ہوا تو پاکستان میں بھی اس کھیل کو پیشہ وارانہ انداز میں سیکھنے اور کھیلنے والوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب شطرنج کے ماہر پاکستانی بہت شوق سے بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور کئی مرتبہ یہ مقابلے جیت کر پاکستان کا نام بھی روشن کر چکے ہیں۔ پاکستان میں شطرنج کھیلنے کے لیے دیسی اور بین الاقوامی دونوں طرح کے قوانین پر عمل کیا جاتا ہے، اگر شطرنج گھروں میں کھیلی جائے تو عموماً دیسی طریقے سے ہی کھیلی جاتی ہے، لیکن اگر شطرنج کے مقابلوں میں اسے کھیلا جائے تو پھر مسلمہ قوانین کے تحت ہی اس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ گھر بیٹھے انٹرنیٹ کے ذریعے شطرنج بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت کی جا سکتی ہے اور انعامات بھی جیتے جا سکتے ہیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ حضور ﷺ پر پہلی وحی کس جگہ نازل ہوئی تھی؟

i۔ غار ثور　ii۔ غار حرا　iii۔ کوہ طور

2۔ نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کی طرف سے کس نے تقریر کی تھی؟

i۔ حضرت عثمان غنیؓ　ii۔ حضرت عمر فاروقؓ　iii۔ حضرت جعفر طیارؓ

3۔ جندب کس صحابی کا اصل نام ہے؟

i۔ حضرت ابوذر غفاریؓ　ii۔ حضرت بلال حبشیؓ　iii۔ حضرت سفیان ثوریؒ

4۔ احرام باندھنا کس عبادت میں فرض ہے؟

i۔ نماز　ii۔ تراویح　iii۔ حج

5۔ انسانی جلد کی اندرونی تہہ کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ ڈرمس　ii۔ لیوسی فیرین　iii۔ لیوسی فیمرز

6۔ سوڈیم کلورائیڈ کس کھانے والی چیز کا نام ہے؟

i۔ چینی　ii۔ نمک　iii۔ آم

7۔ اُس دھات کا نام بتایئے جو ٹھنڈی ہو تو مائع ہوتی ہے؟

i۔ چونا　ii۔ پارہ　iii۔ سیسہ

8۔ شاہد احمد دہلوی برصغیر کے کس عہد ساز ادبی رسالے کے مدیر تھے؟

i۔ ساقی　ii۔ نقوش　iii۔ اوراق

9۔ پاکستان کی سب سے بڑی جھیل کون سی ہے؟

i۔ جھیل سیف الملوک　ii۔ منچھر جھیل　iii۔ کنجھر جھیل

10۔ حبیب جالب کی وجہِ شہرت کیا ہے؟

i۔ اداکاری　ii۔ سیاست　iii۔ شاعری

جوابات علمی آزمائش ستمبر 2012ء

1۔ فتح مبین 2۔ جمعتہ المبارک 3۔ ٹیکر 4۔ نوحہ کرنے والا 5۔ روزہ 6۔ 15 سال 7۔ 1 منٹ 20 سیکنڈ 8۔ 26 9۔ وینس 10۔ ناول نگاری

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد حاشر، پشاور۔　(200 روپے کی کتب)

☆ اروی معطر بیگ، گجرات　(175 روپے کی کتب)

☆ فتح محمد شارق، نوشہرہ　(125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

☆☆ محمد فیضان، کراچی۔ عابدہ الیاس، ہری پور۔ حسان عمران، کراچی۔ آمنہ مسعود، اسلام آباد۔ حفصہ نعیم، گوجرانوالہ۔ رملہ صدیقی، سرگودھا۔ تحریم فاطمہ، ملتان۔ عدینہ جان، ایبٹ آباد۔ محمد محسن علی قادری، حسن رضا سردار، کاموکی۔ نورالعین، لاہور۔ انصر علی، وہاڑی۔ عائشہ مجید، لاہور۔ نصرت بٹ، شیخوپورہ۔ روحین زمان، کرک۔ محمد شکیل بھٹ، ملتان۔ اختر رضا شاہ، ملتان۔ صبا پروین، کوٹری۔ طہ یاسین، حیدرآباد۔ امن وحید بٹ، لاہور۔ حاشر علی ہاشمی، شاہ زیب ذیشان، لاہور۔ حسان بدر، بورے والہ۔ محمد زبیر ارشد، ملتان۔ حمنہ عارف، عارف، لاہور۔ محمد سلمان انجم، محمد شہزاد، نوشہرہ۔ ایم افضل، بورے والہ۔ ناظرہ مقدس، شرقپور۔ امجد جاوید، راول پنڈی۔ عائشہ عاصم، لاہور۔ عبدالحنان، فیصل آباد۔ کومل امجد، ملتان۔ فاطمہ علوی، فیصل آباد۔ شہزاد ستار بھٹی، وہاڑی۔ بابر نذیر، لاہور۔ ایچ ایم سلیم نور، اوکاڑہ۔ محمد شاویز خان، میاں والی۔ محمد عتیق الرحمٰن اسلم، میرپور۔ جویریہ فضا ہاشمی، پشاور۔ تسمینہ ادریس کھتری، کراچی۔ عون عثمان، شیخوپورہ۔ محمد عادل نواب، واہ کینٹ۔ محمد ابوبکر صدیق یوسف زئی، ٹیکسلا۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اکتوبر 2012ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

پتا: ____________

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا نام ہے......!

(ش۔م۔ دانش، میاں والی)

''ارے بیٹا! نورے کی کوئی خبر ملی کہ کہاں مر گیا ہے وہ؟'' یہ چوہدری خیر الدین تھا، میرا سب سے بڑا دشمن۔ نام تو اس کا خیرالدین تھا، لیکن وہ اُس کے بالکل برعکس تھا۔ حد درجہ ظالم،

سفاک، انسانی زندگی کو ایک چیونٹی کی طرح بے دردی سے مسل دینے والا درندہ۔ اسی لیے تو میں اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا، کیوں کہ میری نظروں میں انسانی زندگی کی قیمت بہت زیادہ ہے اتنی زیادہ کہ دُنیا کے تمام ہیرے جواہرات ترازو کے ایک پلڑے میں اور انسانی زندگی دُوسرے پلڑے میں رکھ دی جائے تو انسانی زندگی کی قیمت ان تمام ہیرے جواہرات پر بھاری ہو گی جب کہ وہ انسان کو ایک حقیر کیچوے سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔

''نورا'' جس کے متعلق چوہدری اپنے بیٹے سے پوچھ رہا ہے گاؤں کا ایک شریف النفس انسان تھا۔ نام تو اس کا بڑا پیارا تھا ''نور محمد'' لیکن سب اُسے ''نورا'' کہتے تھے۔

''ابا جان! وہ ابھی کھیتوں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے۔'' اس کے بڑے بیٹے بدرالدین نے کہا۔

''اسے یہاں بلواؤ! میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' چوہدری نے کہا اور اس کا بیٹا نوکروں کو آوازیں دینے لگا۔ میں جانتا ہوں کہ چوہدری، نورے کو اُس کے بیٹے کی پڑھائی بند کرانے کے لیے کہے گا۔ وہ پہلے بھی اس سے ایک بار کہہ چکا ہے، لیکن نورا اسے اپنی غربت کا واسطہ دے کر چلا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا پڑھ کر وکیل بن جائے اور اس طرح ان کی غربت دُور ہو جائے اور گاؤں والوں کا بھی کچھ بھلا ہو جائے، لیکن چوہدری بھلا ایسا کب چاہے گا، وہ تو چاہتا ہے کہ گاؤں والے ان پڑھ ہی رہیں اور پورے گاؤں پر اس کا راج یونہی قائم رہے، وہ جانتا ہے کہ تعلیم ایک طاقت ہے اگر کسی گاؤں والے نے تعلیم حاصل کر لی تو اپنی تعلیم کی وجہ سے اس کے مدِ مقابل کھڑا ہو جائے گا۔

کچھ دیر بعد نورا چوہدری کے پاس پہنچ گیا، اُس نے جھک کر سلام کیا تو چوہدری نے اسے زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ غریبوں کو چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ انہیں اپنے پیروں میں بٹھاتا تا کہ غریبوں اور چوہدریوں کے فرق کا پتہ چل سکے، مجھے اس کا یہ فعل بھی پسند نہیں ہے، میں ہر بار اسے اس بات سے منع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اب بھی اُس کے ایسا کرنے پر میں چیخ اٹھا، لیکن وہ میری طرف سے کان بند کر چکا ہے اس نے میری آواز پر بالکل دھیان نہیں دیا اور نورے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''تمہارا بیٹا کس جماعت میں پڑھ رہا ہے؟'' نورے کو یہ توقع نہیں تھی کہ چوہدری اس طرح شفقت سے یہ بات پوچھے گا اس لیے وہ حیران رہ گیا لیکن پھر حیرت پر قابو پا کر وہ جلدی سے بولا۔

''دسویں جماعت میں چوہدری صاحب!''

''تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ میرے منع کرنے کے باوجود تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اپنے بیٹے کو پڑھانے کی اہمیت کیوں کی! بولو کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو تم؟'' چوہدری نے درشت لہجے میں کہا۔

''چچ چچ چوہدری صاحب! معاف کر دیں چوہدری صاحب! میں گھر کے حالات سے تنگ آ کر اُسے پڑھا رہا ہوں اگر وہ وکیل بن گیا تو ہمارے ہی گاؤں کا فائدہ ہو گا چوہدری صاحب!'' نورا عاجزی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''جو میں نے کہا ہے ویسا کرو اب اگر مجھے اطلاع ملی کہ تمہارا بیٹا پڑھ رہا ہے تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا، تم سمجھتے ہو کہ تمہارا بیٹا پڑھ لکھ کر میرا ہم پلہ ہو سکتا ہے تم حقیر لوگ اتنے بڑے خواب کیوں دیکھتے ہو؟ تمہاری اور تمہارے حقیر بیٹے کی جگہ میرے پاؤں میں ہے سمجھے، محلوں کے خواب دیکھنا چھوڑ دو، اب اگر وہ پڑھنے گیا تو اس کی لاش ہی واپس آئے گی۔'' چوہدری نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو ظالم؟ اگر نورے کا بیٹا پڑھ لکھ گیا تو اس میں گاؤں کا ہی فائدہ ہے۔'' اب کی بار میں خاموش نہ رہ سکا۔ لیکن چوہدری نے میری بات سنی ہی نہیں یا سنی بھی تو اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ تو بس غصے سے نورے کو گھورے جا رہا تھا جو اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

'جاؤ اپنی شکل گم کرو اسی میں تمہاری بہتری ہے ورنہ معافی نہیں ملے گا۔'' چوہدری دھاڑا اور نورا یوں تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا جیسے اس کے پیچھے پاگل کتے لگ گئے ہوں۔ میں اس دوران چیختا رہا، لیکن چوہدری پر کوئی اثر نہ ہوا اُس نے تو مجھے اپنی طرف سے گہری نیند سلا دیا تھا، لیکن میں سونا نہیں چاہتا۔ میں تو جاگتے رہنا چاہتا ہوں اور چوہدری سے اپنی بات منوانا چاہتا ہوں، لیکن وہ تو میری سنتا ہی نہیں۔

☆......☆......☆

''ابا! نورے نے اپنے بیٹے کو راتوں رات شہر میں اپنے ماموں کے ہاں پڑھنے کے لیے بھجوا دیا ہے تاکہ وہ علم کا ہتھیار لے کر آئے اور یہاں آ کر آپ کا مقابلہ کرے۔'' بدرالدین کی اس بات نے تو چوہدری کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

''جاؤ! اسے میرے پاس بھجواؤ جلدی۔'' چوہدری چلایا۔

اب کی بار میں نے چوہدری سے کچھ کہنے کی کوشش نہ کی بلکہ خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد نورا ایک بار پھر چوہدری کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ''اسے درخت پر الٹا لٹکا دو۔'' چوہدری نے حکم صادر کیا۔ اب کی بار تو میں چیخے بغیر نہ رہ سکا۔ نورا جلدی سے چوہدری کے قدموں میں گرنے کے لیے آگے بڑھا۔

''معاف کر دیں چوہدری صاحب!'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ نوکروں نے اسے پکڑ لیا، پھر اسے درخت سے الٹا لٹا دیا گیا۔

''شروع ہو جاؤ کم بخت رحیمے! اس کی ہڈی پسلی ایک کر دو کم بخت ہم سے مقابلہ کرنے چلا ہے۔'' چوہدری نے کہا اور رحیمے نے وہاں پڑا ایک ڈنڈا اٹھایا اور نورے کی پٹائی شروع کر دی۔ نورے کے ساتھ ساتھ میں بھی چیخ رہا تھا، وہ معافی مانگ رہا تھا اور میں چوہدری کو سرزنش کر رہا تھا، لیکن چوہدری کے کان ہم دونوں کی طرف سے بند ہو چکے تھے۔ ''تم اپنے گاؤں کا مستقبل برباد کرنا چاہتے ہو۔'' میں نے آخری کوشش کی اور اُسی لمحے نورا آخری ہچکی لے کر مر گیا ہے۔ سینکڑوں مقتولوں میں ایک اور مقتول کا اضافہ ہو چکا ہے۔

''اس کے بیٹے کو بھی ٹھکانے لگا دو شہر جا کر۔'' چوہدری نے حکم دیا اور واپس چل پڑا۔ اب میں نہیں بول سکتا کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کیوں کہ چوہدری نے میرا گلا بھی گھونٹ دیا ہے۔ میں مر گیا ہوں...... ہاں! میں...... چوہدری کا ضمیر ہوں، میں بھی نورے کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی مر گیا ہوں۔

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

اعزاز

(حسن رضا سردار، کاموکی)

رات کے دو بج چکے تھے۔ بجلی کی کڑک دل دہلا رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ جھینگر کی آواز نے ماحول کو اور بھی ڈراؤنا اور پُراسرار بنا دیا تھا۔ ایسے میں ایک شخص زمین پر منہ کے بل لیٹا کہنیوں کے ذریعے رینگتا ہوا ایک سمت بڑھ رہا تھا۔

یہ راجہ تھا۔ راجہ ایک چوبیس سال کا کڑیل محبِ وطن پاکستانی

کمانڈو تھا۔ 6 ستمبر کی رات بھارتی فوج نے اس کے پیارے وطن پاکستان پر حملہ کیا تو پاک فوج کے ساتھ ساتھ پوری پاکستانی قوم دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔ راجہ کو جب پتا چلا کہ دشمن نے اس کے پیارے وطن کو ختم کرنے کے لیے شب خون مارا ہے تو اس کا خون کھول اٹھا۔ اپنے افسران کے حکم پر دشمن کو نیست و نابود کرنے کا آہنی عزم لے کر وہ اپنے فوجی کیمپ سے نکلا۔ اس کا کیمپ چوں کہ بارڈر کے قریب تھا۔ اس لیے جلد ہی وہ چھپتے چھپاتے بھارتی فوجی کیمپوں کی حدود میں گھس گیا تھا۔ اس کا مشن بھارتی فوج کے اس اسلحہ ڈپو کو تباہ کرنا تھا جس سے بھارتی فوج کو گولہ بارود سپلائی کیا جاتا تھا۔

رات کے اندھیرے میں راجہ کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا اسلحہ ڈپو کی عمارت کے قریب پہنچ گیا۔ ڈپو کی عمارت کے گرد خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ باڑ کے باہر اور ڈپو کی عمارت کے گرد بڑا سخت پہرہ لگا ہوا تھا۔ راجہ سرچ لائٹ کی روشنی سے بچتا بچاتا باڑ کے قریب پہنچ گیا۔

وہ اب وہاں پہنچ چکا تھا جہاں ایک سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ سنتری دائیں سے بائیں طرف جا رہا تھا۔

سنتری بائیں طرف سے ہو کر واپس آیا تو اس نے سگریٹ کا ٹکڑا زمین پر پھینکا اور پاؤں مسلنے کے بعد دائیں طرف کو مڑا۔ راجہ کے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ سنتری نے ابھی چلنے کے لیے پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ اچانک کوندا لپکا راجہ اپنی جگہ سے اچھلا جیسے زمین نے اسے زور سے اچھال دیا ہو۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ سنتری کی پشت پر جا پڑا۔ اس کا بایاں ہاتھ مضبوطی سے سنتری کے منہ پر جم گیا اور دائیں ہاتھ سے اس نے اپنا چاقو سنتری کی گردن پر پھیر دیا۔ سنتری بغیر کوئی آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ راجہ نے جلدی سے اس کی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر گھس کر آہستگی سے بند کر دیا۔ گھپ اندھیرے میں اُس نے پنسل ٹارچ جلائی اور جیب سے پنسل بم نکال کر اس پر پندرہ منٹ کا ٹائم فکس کر کے اسلحے کے درمیان چھپا کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ زمین پر لیٹ کر رینگتا ہوا واپس چلا گیا۔ اپنے کیمپ میں پہنچ کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس سارے مشن پر اسے ساڑھے سترہ منٹ کا وقت لگا تھا۔ اس کے افسران اس کے گرد جمع ہو گئے۔ راجہ نے انہیں ساری بات بتا دی۔ اب دھماکے میں صرف دس سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ سب کی نظریں گھڑیوں کے چمکتے ڈائلوں پر اور ہونٹوں پر دُعائیں تھیں۔ دس سیکنڈ کا عرصہ دس سال کا لگ رہا تھا۔ پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ آگ کے گولے فضا میں بکھر گئے۔ پھر تو دھماکوں کو نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ جوشِ مسرت سے راجہ کا چہرہ گلنار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سجدے میں گر کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ جب راجہ نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کے افسران نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ سرخرو ہو چکا تھا۔ اس نے ناممکن کو ممکن بنا ڈالا تھا۔ ڈپو کی تباہی کے بعد بھارتی فوج کی کمر ٹوٹ گئی تھی اور بھارتی فوج دم دبا کر بھاگ گئی۔ اگلے دن بھارتی چوکیوں پر ترنگے کی بجائے سبز ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔ راجہ کی خدمات کو اعلیٰ سطح پر سراہا گیا۔ حکومت نے اسے تمغۂ شجاعت سے نوازا۔ یہ تو دنیوی اعزاز تھا۔ آخرت میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کا سب سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑا اعزاز اس کا انتظار کر رہا تھا۔

(دُوسرا انعام انعام: 175 روپے کی کتب)

پانی

(امجد اقبال کمی، کبیر والا)

گدری مرغی اپنے دو بچوں کے ساتھ شیشم کے گھنے درخت کے نیچے بیٹھی تھی کہ اچانک ایک سبز رنگ کی چڑیا اُڑتی ہوئی آئی

اور بولی: ''بی بی جی! مجھے سخت پیاس لگی ہے، مہربانی کر کے مجھے پانی دے دیں آج مجھے سخت پیاس میں پانی کہیں سے بھی نہیں مل رہا۔''

''کیا دیکھ نہیں رہی ہو میرے بچے پانی پی رہے ہیں اگر تم نے سارا پانی پی لیا تو میرے بچے کیا پئیں گے۔'' مرغی نے حقارت سے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''بی بی جی! یہ پانی تو کافی زیادہ ہے، میں نے کون سا سارا پینا ہے...... خدا کے لیے پینے دیں...... پیاس سے میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔'' ننھی چڑیا نے کہا۔

''چل...... دفع ہو جا...... ایک دفعہ کہا ہے کہ میں پانی نہیں دے سکتی۔'' گدری مرغی نے غصے سے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

گرمی زوروں کی پڑ رہی تھی۔ جانور پانی کو ترس گئے تھے کیوں کہ گرمی کی وجہ سے دریا اور تالاب خشک ہو چکے تھے۔ ننھی چڑیا مایوس ہو کر ایک طرف کو اڑ گئی۔ پھر وہ پانی تلاش کرنے لگی۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ پہاڑوں پر جا کر دیکھنا چاہیے۔ اب تو اس سے اڑنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اچانک اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایک درخت کے نیچے پانی کا ایک کٹورا پڑا تھا۔ ننھی چڑیا نے وہاں سے جی بھر کے پانی پیا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

☆......☆......☆

ادھر جب گدری مرغی کا سرخ رنگ کا چوزہ پانی پینے لگا تو اس سے پانی کا برتن اُلٹ گیا جس سے سارا پانی ضائع ہو گیا۔ اب تو مرغی بہت پریشان ہوئی اُس نے سوچا کہ خدا نے اُس سے بدلہ لے لیا ہے کیوں کہ اس نے ننھی چڑیا کو پانی نہیں پینے دیا تھا۔ پھر وہ ننھی چڑیا کی طرح پانی کی تلاش میں نکل پڑی۔ پھر وہ اسی کٹورے کے پاس پہنچی جہاں ننھی چڑیا بیٹھی تھی۔ مرغی نے شرمندگی سے کہا:

''ننھی چڑیا! مجھے معاف کر دو، میں اپنی غلطی پہ نادم ہوں۔ میرے بچے پیاس سے مر جائیں گے۔ مجھے پانی چاہیے۔'' مرغی ندامت سے کہہ رہی تھی۔

ننھی چڑیا نے کہا: ''آپ ضرور پانی پئیں۔ بے شک سارا پانی پی جائیں۔ ہمیں جب اللہ تعالیٰ کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو ہمیں غرور و تکبر نہیں کرنا چاہیے۔''

گدری مرغی اپنے کیے پر بہت شرمندہ تھی اس نے آئندہ ایسا کرنے سے توبہ کر لی تھی۔

پھر طوطا اڑتا ہوا آیا اُس نے پانی طلب کیا تو گدری مرغی نے فراخدلی سے کہا: ''پیو پانی...... چاہے سارا پی لو۔''

ننھی چڑیا یہ سن کر بے حد خوش ہوئی۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

☆......☆......☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

خزانہ

کاشف نیازی

میاں چنوں ہمارا آبائی گاؤں ہے جو ملتان سے صرف 50 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہمارے نانا ابو اور نانی اماں وہاں رہائش پذیر تھے۔ وہ ہم سے بہت محبت کرتے تھے۔ میاں چنوں میں آموں اور بیروں کے بہت سے باغات تھے۔ ان باغات کے اردگرد کھیت تھے۔ گاؤں سے ایک نہر بھی گزرتی تھی جس میں کبھی کبھار نہانے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

ایک دن جب ہمیں پتہ چلا کہ ہم میاں چنوں جا رہے ہیں تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس موقع پر میرے چھوٹے بھائی نے کہا: "بھیا! وہاں جا کر خوب کھیلیں گے، بیر کھائیں گے اور نہر میں بھی نہائیں گے۔"

اگلے دن ہم بس سے سفر کرتے ہوئے چار گھنٹے میں ہی میاں چنوں پہنچ گئے۔ نانا جان ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور نانی اماں نے ہم دونوں بھائیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں اور گڑ کا شربت پلایا۔ اسی دوران شام ہو گئی اور نانا جان مسجد میں چلے گئے۔ ہم دونوں بھائی گھر سے باہر آ گئے تاکہ اپنے دوستوں سے مل سکیں۔

نانا جان کے گھر میں ایک پرانا کنواں تھا۔ یہ گھر بہت قدیم تھا اور پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہندو رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی آبی ضروریات کے لیے یہ کنواں کھدوایا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ہندو تو ترک وطن کر کے بھارت چلے گئے اور اپنا یہ کنواں خود ہی بند کر گئے۔ جب میرے نانا نے یہ گھر خریدا تو اس میں پرانا کنواں بدستور موجود تھا، لیکن مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ میں اور عاصم جب بچپن میں نانا ابو کے گھر جاتے تو اس کنویں کے اردگرد کھیلتے تھے۔ یہ کنواں زیادہ گہرا نہ تھا۔ کنواں اتنا گہرا تھا کہ اگر ایک درمیانے قد کا آدمی اس میں سیدھا کھڑا ہو جاتا تو اُس کے سر اور کندھے باہر نظر آتے تھے۔

رفتہ رفتہ گھر والوں نے گھر کا کوڑا کرکٹ اس کنویں میں ڈالنا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے کنویں میں سے ہر وقت بدبو آتی رہتی تھی۔ اس بدبو کا بعد میں یہ حل کیا گیا کہ ایک ہفتہ بعد کوڑا کرکٹ کو آگ لگا دی جاتی۔ اگرچہ ہم اس کنویں کے اردگرد کھیلتے تھے، لیکن ہمیں اس سے بہت خوف آتا تھا۔ اردگرد کے گھر والوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اس کنویں میں جن رہتے ہیں جو بچوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ رات کو ہم کبھی کنویں کے نزدیک نہ گئے تھے۔

میاں چنوں میں دو دن تو رشتہ داروں سے ملنے ملانے اور گھومنے پھرنے میں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن ہماری نانی اماں نے ہم سے کہا کہ اے لڑکو یہ لہسن اُگا ہوا ہے۔ تم جوان اور صحت مند ہو ذرا اس کی گوڈی ہی کر دو۔

دراصل یہ گھر بہت وسیع و عریض تھا۔ ایک جانب کمرے تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جن کے سامنے کھلا صحن تھا۔ اس صحن میں نانی اماں نے کچھ گھریلو سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ ان دنوں یہاں لہسن کی فصل اگی ہوئی تھی۔

نانا جان گاؤں کے پٹواری تھے جو دن بھر اپنے کاموں میں مصروف رہتے اور شام ڈھلے گھر آتے تھے۔ اسی وجہ سے ان سبزیوں کی دیکھ بھال نانی اماں کو خود ہی کرنا پڑتی تھی۔ کیاریوں میں لہسن کے بوٹے اُگے ہوئے تھے اور نانی اماں ہم سے کہہ رہی تھیں کہ ان کیاریوں کی گوڈی کر دو تاکہ بعد میں ان کو پانی دیا جا سکے۔

چنانچہ میں اور عاصم گوڈی کرنے میں جت گئے۔ اس کام کے دوران عاصم نے مشورہ دیا کہ اگر پرانے کنویں میں موجود مٹی ان کیاریوں میں ڈالی جائے تو لہسن کی فصل بہت اچھی ہوگی۔ شام کو جب نانا جان آئے تو میں نے انہیں بتایا کہ عاصم کہتا ہے کہ اگر پرانے کنویں کی مٹی کیاریوں میں ڈالی جائے تو لہسن کے لیے بڑی مفید ہوگی۔

نانا جان یہ سن کر بولے: ''ہاں لڑکو! زرخیز مٹی لہسن کو موٹا کرتی ہے۔ مجھے تو فرصت نہیں تم خود ہی اس کام کو کرو۔ سٹور میں کسی موجود ہے۔ کل کسی سے مٹی جمع کر کے کیاریوں میں ڈال دینا۔''

چنانچہ نانا جان سے اجازت ملنے کے بعد ہم مطمئن ہو گئے۔

اگلے روز ہم نے پرانے کنویں میں موجود مٹی کھودنی شروع کر دی۔ عاصم کسی سے مٹی کھودتا جاتا اور میں اُسے کیاریوں میں بکھیر دیتا۔ اس کام کے دوران ہمیں کئی گھنٹے گزر گئے۔ ہم دونوں پسینے میں شرابور ہو چکے تھے۔ اب کنویں کی تہہ میں موجود تمام مٹی ختم ہو چکی تھی اور نیچے موجود جمی ہوئی تھوڑی سی مٹی نظر آ رہی تھی۔ اسی دوران ہم نے یہ طے کیا کہ یہ مٹی بھی زرخیز ہے لہٰذا اسے بھی نکال لینا چاہیے۔ اس کام میں ہمیں آدھا گھنٹہ مزید لگ گیا۔ پھر اچانک ایک عجیب واقعہ ہوا۔ عاصم کنویں میں سے کسی کے ذریعے مٹی کھود رہا تھا کہ اچانک کسی کسی سخت چیز سے ٹکرائی تھی۔ عاصم رک گیا اور اُس سخت چیز کو دیکھنے لگا جو شاید کوئی لوہا معلوم ہوتی تھی۔

''کیا ہوا عاصم؟'' میں نے پوچھا۔

''بھیا! ذرا نیچے آنا'' عاصم بولا ''بھلا یہ کیا ہے؟''

میں یہ سن کر کنویں کی منڈیر پر چڑھا اور نیچے کود گیا اب کنویں میں ہم دونوں موجود تھے اور لوہے کی اُس سیاہ تختی کو دیکھ رہے تھے جو زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ میں نے عاصم کے ہاتھ سے کسی لی اور آہستہ آہستہ اُس تختی کو باہر نکالنا شروع کیا، لیکن مجھے اپنی کوشش میں ناکامی ہوئی کیوں کہ تختی بہت سخت تھی اور زمین سے نکلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

''عاصم ذرا سٹور سے کدال لے آؤ۔'' میں نے عاصم سے کہا۔

وہ منڈیر پر چڑھ کر اُوپر گیا اور کدال اٹھا لایا۔ اب ہم نے کدال سے زور آزمائی شروع کی۔ عاصم ایک طرف سے کسی کے ذریعے زمین کھود رہا تھا جب کہ دُوسری طرف سے میں تختی کو کدال سے باہر نکال رہا تھا۔

ہم دونوں کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ ہمارے جسم پسینے سے شرابور تھے اور ہمیں بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کنویں میں کئی گھنٹے کام کرنے کی وجہ سے مٹی ہمارے چہروں، بازوؤں اور کپڑوں پر لگ چکی تھی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم صحیح معنوں میں بھوت دکھائی دے رہے تھے۔

آخر کار ہماری محنت رنگ لائی اور تختی کا ایک کونا زمین سے باہر نکل آیا، لیکن یہ کیا؟ یہ کوئی تختی نہ تھی بلکہ سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا صندوق تھا جو زمین میں دفن کیا گیا تھا۔

میں اور عاصم حیران تھے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس صندوق کو باہر نکال کر ہی دم لیں گے۔ پھر ہم تیزی سے کھدائی میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد صندوق زمین سے باہر تھا۔ یہ ایک لوہے کی مضبوط چادر سے بنا ہوا صندوق تھا جس کی لمبائی تقریباً دو فٹ اور چوڑائی ڈیڑھ فٹ تھی۔ اس صندوق پر ایک مندر کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ صندوق کی کنڈی میں ایک بوسیدہ تالا لگا ہوا تھا۔ ہم نے صندوق کے تالے کو کھولنے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔

اسی دوران ہماری نانی اماں باورچی خانے سے بولیں۔ ''اے لڑکو! کہاں ہو تم؟ کیا دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤ گے؟''

نانی اماں کی آواز سنتے ہی ہم دونوں بھائیوں نے برق رفتاری سے صندوق کو زمین پر رکھ کر مٹی سے ڈھانپ دیا اور کنویں سے باہر آ گئے۔ نانی اماں باورچی خانے سے باہر کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھیں ان کی ہدایت پر ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھانے کے لیے برآمدے میں آ گئے۔ نانی اماں نے ایک پیالی میں سالن اور دوسری پیالی میں گھی اور شکر لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا اس کے ساتھ تندوری روٹیاں اور نمکین لسی بھی تھی۔ ہم صبح سے کام کر کے تھکے ہوئے تھے اس لیے ڈٹ کر کھانا کھایا اور برآمدے میں بچھی ہوئی چٹائی پر ہی قیلولے کے لیے لیٹ گئے۔ ہم بہ ظاہر سو رہے تھے، لیکن نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ صندوق کس کا ہے؟ اور اُس میں کیا ہے؟ شام کو نانا جان آ

گئے جن کے ساتھ روزانہ کی طرح معمول کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران میں نے عاصم کو سختی سے منع کر دیا کہ کسی سے اُس صندوق کی بات نہ کرے۔

اگلے دن ہم نہر پر نہانے چلے گئے اور بارہ بجے تک وہیں پر کھیلتے کودتے رہے۔ بارہ بجے کے بعد جب ہم واپس گھر آئے تو ہمیں پھر اُس صندوق کا خیال آیا۔ طے یہ ہوا کہ دوپہر کو جب سب سو جائیں گے تو اس صندوق کو چھت پر لے جا کر کھولا جائے گا چنانچہ ایک گھنٹے بعد جب نانی اماں اور ہماری والدہ اپنے کمرے میں چلی گئیں تو ہم نے اپنے منصوبے کے مطابق صندوق کو کنویں سے نکالا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر لے گئے

''بھیا! آخر اس صندوق میں ہے کیا؟ عاصم نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتہ۔ ابھی دیکھتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

سب سے پہلے ہم نے چھت کا سیڑھیوں والا دروازہ بند کیا اور صندوق کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ہم آہنی سلاخ سے صندوق کا تالا کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب ہم نے صندوق کا ڈھکن کھولا تو ہمیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

صندوق میں بوسیدہ اخبارات، ایک زنگ آلود چاقو اور تین مٹی کے دیئے تھے۔ ہم نے ان چیزوں کو باہر نکالا اور صندوق کا نچلا خانہ کھولا۔ اسے کھولتے ہی ہمیں حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نچلے خانے میں سونے اور چاندی کے بیش قیمت زیورات تھے۔ ہم دونوں بھائی حیران و پریشان ہو کر ان زیورات کو دیکھ رہے تھے۔

"اب کیا کریں؟" عاصم نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ۔" میں نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر ہم دونوں بھائی اسی طرح صندوق کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر ہم دونوں نے ایک فیصلہ کیا اور صندوق کو چھت پر موجود کوٹھری میں لکڑیوں کے ڈھیر کے نیچے چھپا دیا۔ فیصلہ کرنے کے بعد ہم دونوں مطمئن ہو گئے۔ وہ دن ہم نے بہت اطمینان سے گزارا۔ اگلے دن جب نانا ابو صبح کی نماز کے بعد سیر کر کے واپس آئے تو ہم دونوں بھائی اُن کے پاس گئے اور انہیں ساری بات بتادی۔

نانا جان یہ سن کر بولے۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو سارا ماجرا مجھ سے بیان کر دیا۔ چھوٹوں میں جس کام کے کرنے کی صلاحیت نہ ہو انہیں چاہیے کہ وہ بڑوں سے اس بارے میں مشورہ کر لیں۔"

اس کے بعد نانا جی ہمارے ساتھ چھت پر گئے اور صندوق کو کھول کر دیکھا۔ اتنے ڈھیر سارے قیمتی زیورات دیکھ کر نانا جان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہوں نے وہ سارے زیورات صندوق سے نکالے انہیں ایک کپڑے میں باندھا اور گاؤں کے امام مسجد مولانا قطب الدین صاحب کے پاس لے گئے۔ اور انہیں سارا واقعہ بتایا۔ مولانا قطب الدین نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں پر مشتمل ایک پنچایت بلوائی اور مشورہ کیا کہ ان زیورات کا کیا کیا جائے۔ گاؤں کے لوگ حیران تھے کہ آخر یہ خزانہ اس پرانے کنویں میں کس نے چھپایا۔ وہ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ آخر ایک بوڑھے کسان نے بتایا کہ اس مکان میں پاکستان بننے سے پہلے ایک ہندو لالہ پریم پرشاد رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے خود ہی یہ خزانہ اس کنویں میں چھپا دیا ہو کہ جب موقع ملے گا کہ بھارت سے آ کر اسے نکال لے گا، لیکن بعد ازاں شاید اسے اس کا موقع نہ مل سکا۔ بہر حال گاؤں کے لوگوں کے مشورے سے یہ بات طے پائی کہ چونکہ گاؤں میں کوئی ڈسپنسری نہیں ہے جس کی وجہ سے بیماروں کو شہر کے بڑے ہسپتال میں لے جانا پڑتا ہے۔ لہٰذا ان سارے زیورات کو بیچ کر ان سے حاصل ہونے والی رقم سے گاؤں میں ڈسپنسری بنائی جائے گی۔

چنانچہ اُس سال تو ہم اپنی چھٹیاں گزار کر ملتان واپس چلے گئے۔ البتہ اگلے سال جب ہم آئے تو ہم نے دیکھا کہ گاؤں میں "الشفا میڈیکل ڈسپنسری" کھل چکی ہے۔ یہ ڈسپنسری اب بھی ہے۔ مجھے اور عاصم کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ ہمارے ہاتھوں ایک نیک کام پایۂ تکمیل تک پہنچا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

ستمبر کا شمارہ زبردست تھا۔ اوجھل خاکے میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اسے جاری رکھیے گا۔ (محمد احمد خان، جھنگ)

لوٹ لو، شیرا، مہینے کے آخری دن، وہ کون تھا؟ اور نیند کہانیاں عمدہ تھیں۔ (عائشہ مجید، لاہور)

معیاری کہانیوں، چٹ پٹے لطائف اور خوب صورت سرورق سے سجا ''تعلیم و تربیت'' تین تاریخ کو ملا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ پیارے اللہ کے پیارے نام بہت اچھا سلسلہ ہے۔ (علشبہ نورین، لاہور)

لوٹ لو اور نیند بہترین کہانیاں تھیں۔ کیا سلسلہ ''میری زندگی کے مقاصد'' ختم کر دیا گیا ہے؟ (محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

☆ یہ سلسلہ ختم نہیں کیا گیا، اس مرتبہ یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔

ستمبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ گدھا نامہ، فالتو چوزے، لوٹ لو اور نیند بہترین تحریریں تھیں۔ نیا سلسلہ ''پیارے اللہ کے پیارے نام'' بہت پسند آیا۔ (محمد مسعود احمد بھٹی، رینالہ خورد)

انکل! آپ سرورق پر قدرتی مناظر کی تصاویر بھی دیا کریں۔
(اکمل رضا، کراچی)

چچا تیز گام کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ ستمبر کا شمارہ مجموعی طور پر عمدہ تھا۔
(علی شہروز، فیصل آباد)

☆ چچا تیز گام اپنی تیزی کے باعث تھک گئے ہیں، اگلے ماہ ان شاء اللہ چچا آپ کے درمیان موجود ہوں گے۔

لوٹ لو، نیند اور وہ کون تھا؟ اچھی کہانیاں تھیں۔ بادل کالے بادل اور بھولا بھالو اسکول چلا عمدہ نظمیں تھیں۔ انوکھی دُنیا اچھا ناول ہے۔
(حسن رضا سردار، کاموکی)

ستمبر کے شمارے میں شیرا، وہ کون تھا؟، فالتو چوزے، لوٹ لو اور نیند کہانیاں پسند آئیں۔ (عبدالمغنی، ڈیرہ غازی خان)

ہمارے گھر میں سبھی ''تعلیم و تربیت'' شوق سے پڑھتے ہیں۔ سونو کا بچہ، وہ کون تھا؟، مہینے کے آخری دن اور لوٹ لو بہترین کہانیاں تھیں۔ (حارث تنویر، لاہور)

ستمبر کے شمارے کا سرورق بہت زبردست تھا۔ کھوج لگایئے، کھیل دس منٹ کا، ہمارے پسندیدہ سلسلے ہیں انہیں جاری رکھیے گا۔
(ماہ نور عثمانی، زین عثمانی، کراچی)

☆ یہ سلسلے جاری رہیں گے۔

وہ کون تھا؟ اچھی کہانی تھی۔ (طیبہ عظیم، لاہور)

''تعلیم و تربیت'' میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ ستمبر کے شمارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ (عمر عباس، گجرات)

ستمبر کے شمارے کا سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ اداریہ فکر انگیز تھا۔ ''آیئے عہد کریں۔'' بچوں کی کردار سازی کے لیے بہترین سلسلہ ہے۔ نیند موضوع کے اعتبار سے منفرد کہانی ہے۔ (محمد زبیر ارشد، ملتان)

لوٹ لو، شیرا اور فالتو چوزے کہانیاں پسند آئیں۔
(محمد وحید، راول پنڈی)

شیرا دل کو گرما دینے والی کہانی تھی۔ عقیل عباس جعفری اور علیم ڈار پر مضامین عمدہ تھے۔ (سعد عمران، کراچی)

آپ ''شیزان'' والوں کا اشتہار شائع کرتے ہیں، یہ اچھی بات نہیں۔ (غازی خان، لاہور)

☆ آپ نے شاید اب ہمارا رسالہ نہیں دیکھا، جولائی 2012ء کے شمارے سے یہ اشتہار اب شائع نہیں ہو رہا۔

ستمبر کا شمارہ ہمیشہ کی طرح عمدہ تھا۔ (محمد ذیشان اقبال، پشاور)

شیرا، مہینے کے آخری دن، فالتو چوزے، لوٹ لو اور نیند اچھی کہانیاں تھیں۔ (اَروٰی معطر بیگ، گجرات)

''لوٹ لو'' بہترین تحریر تھی۔ (ایچ ایم سلیم نور، اوکاڑہ)

''پیارے اللہ کے پیارے نام'' اچھا سلسلہ ہے۔
(تحریم فاطمہ، ملتان)

لوٹ لو، گدھا نامہ اور شیرا کہانیاں پسند آئیں۔
(محمد حذیفہ انوار، جھنگ صدر)

WWW.PAKSOCIETY.COM

معلوماتِ عامہ، مختصر مختصر، کھوج لگایئے، بلاعنوان اور بچوں کا انسائیکلوپیڈیا سلسلے بہترین ہیں۔ (عاصم جمیل، اسلام آباد)

ستمبر کا شمارہ حسبِ معمول عمدہ کہانیوں سے سجا ہوا تھا۔
(رخسار خان، پشاور)

انکل! میں ایک کہانی بھیج رہی ہوں اسے ضرور شائع کیجیے گا۔
(نور فاطمہ، کراچی)

☆ کہانی معیاری ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

ستمبر کا ''تعلیم و تربیت'' انتہائی دل کش سرورق، دیدہ زیب تصویروں، بامقصد کہانیوں، دل چسپ نظموں اور معلوماتی مضامین سے مزین ملا تو دل اسے پڑھ کر خوش ہو گیا۔ ''انوکھی دُنیا'' عمدہ ناول ہے۔
(محمد محسن علی قادری، کاموکی)

ستمبر کے شمارے میں حمد و نعت کی کمی محسوس ہوئی۔ (محمد جنید، بھوآنہ)

☆ تازہ شمارے میں حمد شاملِ اشاعت ہے۔

تعلیم و تربیت کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں شائع ہونے والی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ (نورالعین اختر، راول پنڈی)

میں آپ سے ناراض ہوں کیوں کہ آپ میرا خط شائع نہیں کرتے۔ آپ میرا خط شائع کریں یا نہ کریں میں اپنا پیارا رسالہ پڑھتا رہوں گا۔ (حافظ صدیق، لکی مروت)

☆ اب تو آپ ناراض نہیں۔

ستمبر کا شمارہ اچھا تھا۔ سرورق نے دل موہ لیا۔
(عاطف اورلیس، میاں چنوں)

آپ نے شیزان کا اشتہار بند کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ میں آپ کے اس عمل سے بہت خوش ہوں۔ (محمد اسعد مدنی، نوشہرہ)

''تعلیم و تربیت'' پڑھنے سے میری اُردو اچھی ہو گئی ہے۔
(راحت اقبال، کراچی)

ستمبر کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ (ثناء جمال، اسلام آباد)

''پیارے اللہ کے پیارے نام'' کے عنوان سے آپ نے جو سلسلہ شروع کیا ہے، اس پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔
(ارم شہزادی، تاندلیانوالہ)

لوٹ لو، نیند اور شیرا کہانیاں بہت پسند آئیں۔ (اکبر علی، لاہور)

ستمبر کے شمارے کا سرورق اچھا لگا۔ سونو کا بچہ، مہینے کے آخری دن، فالتو چوزے اور لوٹ لو کہانیاں اچھی تھیں۔ ''بچوں کا انسائیکلوپیڈیا'' عمدہ سلسلہ ہے۔ (محمد مبشر، ڈیرہ اسماعیل خان)

پیارے اللہ کے پیارے نام، لوٹ لو، وہ کون تھا؟ اور قائداعظم اور بچے تحریریں اچھی تھیں۔ (عائشہ رضا، کراچی)

ستمبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ فالتو چوزے، لوٹ لو اور گدھا نامہ کہانیاں اچھی لگیں۔ (اسماء افضل، لاہور)

انکل! میں نے اپنے مدرسے میں ''تعلیم و تربیت'' کے چار قارئین بنا لیے ہیں۔ (محمد ابوذر غفاری، فیصل آباد)

☆ شاباش، اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔

''درسِ قرآن و حدیث'' ہر مرتبہ کی طرح بہترین تھا۔
(عفان عثمان، شیخوپورہ)

''انوکھی دُنیا'' میرا پسندیدہ ناول ہے۔ اس کے کچھ صفحات بڑھا دیں۔ (محمد شہزاد حیدر، لاہور)

''تعلیم و تربیت'' ہمارے گھر میں بیس سال سے آ رہا ہے۔ اس کی تحریروں کا معیار بہت عمدہ ہے۔ (اسد ندیم، بھکر)

کیا چچا تیز گام کی کہانیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے؟
(رضا عباس، ملتان)

☆ یہ سلسلہ ختم نہیں کیا گیا۔ چچا تیز گام دو تین ماہ کی رخصت پر گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ چچا اگلے ماہ تک آ جائیں گے۔

آپ ذہین بچوں کے تعارف پر مبنی ایک سلسلے کا آغاز کریں۔ یوں باصلاحیت بچوں کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ (جویریہ شہزادی، کوٹ مومن)

''انوکھی دُنیا'' کی قسط نمبر 9 بہت پسند آئی۔ (تحسین گل، پشاور)

آپ نے سلسلہ ''قند مکرر'' شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ یہ سلسلہ کب شروع کیا جا رہا ہے؟ (حامد نسیم، ایبٹ آباد)

☆ اس سلسلے کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ کب اس کا آغاز ہو گا۔

''آپ کا خط ملا'' کے صفحات بڑھا دیں۔
(محسن رضا آفتاب، بھابڑہ شریف)

ستمبر کے شمارے کا سرورق عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔
(سحر اشفاق، واہ کینٹ)

نیند بہترین کہانی تھی۔ (صاحبزادہ محمد عادل، ڈیرہ اسماعیل خان)

WWW.PAKSOCIETY.COM

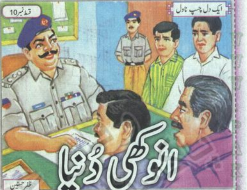

''کیا آپ جمیل صاحب بات کر رہے ہیں؟''

''جی...... جی...... میں جمیل ہی بول رہا ہوں، آپ کون ہیں؟'' جمیل نے پوچھا۔

''میں انسپکٹر ذاکر بات کر رہا ہوں۔''

''جی فرمایئے۔''

''آپ کا بیٹا عمر اور اس کا دوست جواد اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں، عمر کی زبانی مجھے ساری بات کا علم ہوگیا ہے، جگو اور اس کے ساتھی قانون کی گرفت میں ہیں، آپ سٹی تھانے آ جایئے اور اپنے بیٹے کو لے جایئے۔'' انسپکٹر ذاکر کی بات سن کر جمیل نے بے اختیار کہا۔

''آپ جو کہہ رہے ہیں کیا وہ سچ ہے!''

''جی، میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سو فیصد سچ ہے۔''

''میں ابھی سٹی تھانے پہنچ رہا ہوں۔'' جمیل نے کہا۔

کچھ دیر بعد جمیل سٹی تھانے کی طرف چل پڑا۔ اُس نے جواد کے والد کو بھی ساری بات بتا دی تھی۔ ایک گھنٹہ بعد بھی لوگ سٹی تھانے میں موجود تھے۔

''میں آپ کو سیلوٹ کرتا ہوں، آپ جیسے لوگ ہی ہمارے وطن کا مان ہیں۔ آپ نے راجو کے خلاف گواہی دے کر حب الوطنی کا ثبوت دیا ہے۔ ہم جگو کے ذریعے بہت جلد راجو کو بھی گرفتار کرلیں گے، آپ کو اب نہایت ہوشیاری سے رہنا ہوگا کیوں کہ جگو کے پکڑے جانے کے بعد راجو کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' انسپکٹر ذاکر نے جمیل کو مخاطب کیا۔

''میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ضمیر کی آواز پر کیا ہے، راجو جیسے لوگ ہی ہمارے ملک کو بدنام کرنے کا باعث بنتے ہیں، ایسے لوگوں کو بے نقاب کرنا ہم سب کا فرض ہے۔''

جمیل کی بات سن کر عمر نے آگے بڑھ کر کہا۔

''پاپا! مجھے آپ پر ناز ہے۔''

پھر سب لوگ گھر آ گئے۔ سبھی بہت خوش تھے۔ عائشہ اپنے بھائی عمر کو دیکھ کر آب دیدہ ہوگئی تھی۔ سب نے اس مصیبت سے نجات ملنے پر شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ ان کے گھر ملنے والوں کا خاصا رش تھا۔ سب عمر کی بازیابی پر مبارک دینے کے لیے آئے تھے۔ اتوار کو عمر اپنے پاپا کے ساتھ سپاہی نواز رضا کے گھر گئے۔ یہ وہ فرض شناس سپاہی تھا جس نے اپنی جان پر کھیل کر عمر اور جواد کو جگو کا تعاقب کر کے رہائی دلائی تھی۔ جمعرات کی بات تھی۔ نواز رضا نہر کے پاس ناکے پر کھڑا تھا کہ ایک سرخ رنگ کی کار وہاں سے گزری تو نواز رضا نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کار کو اس وقت جگو چلا رہا تھا۔ اس نے دائیں طرف کار کو موڑ کر اس کی رفتار بہت تیز کر دی۔ نواز رضا نے یہ دیکھ کر اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور جگو کا تعاقب کرنے لگا۔ جگو جلد ہی اپنی کار کو مین روڈ پر لے آیا تھا۔ رات ہونے کے باعث ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ پل

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے قریب جا کر جگو نے نواز رضا پر فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ کے باوجود نواز رضا نے جگو کا تعاقب جاری رکھا۔ لال پل کے قریب کار ایک جھٹکے سے بند ہو گئی تھی۔ کار بند ہونے کی دیر تھی کہ عمر اور جواد چھلانگ لگا کر سڑک سے ہوتے ہوئے کھیتوں میں گھس گئے تھے۔ جگو نے خطرہ بھانپ کر بھاگنے کی کوشش کی، مگر نواز رضا تب تک اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

''بچو! باہر آ جاؤ اب تم خطرے سے باہر ہو۔'' نوار رضا نے عمر اور جواد کو آواز دی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ دونوں کسی مصیبت میں تھے۔ کچھ دیر بعد دونوں سہمے ہوئے نواز رضا کے سامنے موجود تھے۔ جگو خود کو نواز رضا کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ نواز رضا کے اطلاع کرنے پر پولیس کی بھاری نفری وہاں پہنچ گئی تھی۔

''تم نے اچھا نہیں کیا۔'' جگو نے نواز رضا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''چلو بیٹھو پولیس وین میں۔'' نواز رضا بولا۔

''میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔'' جگو دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔

''ہاں، ہاں ہم سب کو دیکھ لینا، لیکن پہلے تم تھانہ تو دیکھ لو، چلو بیٹھو وین میں۔'' اس بار نواز رضا کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

نواز رضا، عمر اور اس کے پاپا کو اپنے گھر دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ وہ جس کمرے میں بیٹھے تھے اس کی ایک دیوار پر پولیس کی وردی میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر آدمی کی تصویر آویزاں تھی۔ عمر نے جب تصویر کی طرف دیکھا تو نواز رضا نے کہا۔

''یہ میرے والد کی تصویر ہے، یہ پندرہ سال پہلے ایک بم دھماکے میں شہید ہو گئے تھے۔ وہ ایک مسجد کے باہر اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے کہ انہیں ایک شخص پر شک ہوا تو وہ جونہی اس کی تلاشی لینے لگے اس خودکش بمبار نے خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ اس دھماکے میں میرے والد سمیت 30 افراد شہید ہوئے تھے، اپنے والد کی جگہ اب مجھے پولیس میں ملازمت ملی ہے، میں اپنے والد کے مشن کو جاری رکھوں گا۔''

عمر اور اس کے پاپا نے دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے فرط جذبات سے نواز رضا کی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔

☆

رات کے وقت عمر اپنے کمرے میں تھا تو ڈولی شیلف سے اتر کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔ عائشہ نے عمر کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ عمر اور جواد کے اغوا ہونے کے بعد رانی اور روشنی کے ساتھ مل کر ڈولی ہم سب کو اس ٹھکانے تک لے گئی تھی جہاں جگو نے تم دونوں کو قید کر رکھا تھا۔ عمر نے ڈولی کو مخاطب کیا۔

''ڈولی شکریہ...... بہت بہت شکریہ۔''

''اس میں شکریے والی کون سی بات ہے، تمہیں شکریہ تو رانی اور روشنی کا ادا کرنا چاہیے جن کے باعث مجھے پتا چلا تھا کہ تم اور جواد کہاں قید ہو۔''

''رانی اور روشنی کیا یہاں آ سکتی ہیں؟''

''بالکل آ سکتی ہیں، تم کہو تو میں انہیں ابھی بلا لاتی ہوں۔''

''اب تو بہت رات ہو گئی ہے، کیا اس وقت تمہارے لیے باہر جانا ممکن ہو گا؟'' عمر نے پوچھا۔

''ہاں میں باہر جا سکتی ہوں، میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی، تم تب تک سونا مت، میں بس یوں گئی اور یوں آئی۔'' یہ کہہ کر ڈولی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ایک گھنٹہ بعد ڈولی واپس آئی تو روشنی اور رانی اس کے ساتھ تھیں۔

''عمر! تمہیں رہائی مبارک ہو۔'' روشنی نے عمر کو دیکھتے ہی کہا۔

''خیر مبارک، میں تم دونوں کا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے ڈولی کو میرے اور جواد کے بارے میں بتایا تھا، تم دونوں کی حالت بہت خراب ہے، میں ایک جلد ساز سے تمہاری جلد تبدیل کروا دوں گا۔ میں تمہاری حالت بدلوں گا۔'' عمر ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ گلی سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ عمر نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے سڑک پر جھانکا تو اسے سفید رنگ کی گاڑی میں دو آدمی دکھائی دیے۔ وہ ان آدمیوں کو جگو کے اڈے پر پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دونوں مسلسل ہوائی فائرنگ کرنے میں مصروف تھے۔ عمر سمجھ گیا تھا کہ یہ راجو کے بندے ہیں اور وہ اس کے پاپا کو ہراساں کرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے لیے آئے ہیں۔ جمیل نے اسی وقت انسپکٹر ذاکر کو فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر بعد دو سپاہی جمیل کے گھر کے باہر پہرہ دینے لگے۔

پہلے پہل تو راجو کے ساتھی گلی میں ہوائی فائرنگ کر کے گئے تھے۔ اس سے اگلے روز سپاہیوں کی موجودگی کے باوجود وہ جمیل کے گھر کے مین گیٹ کو گولیوں کا نشانہ بنا کر گئے تھے۔ سب گھر والے خوف میں مبتلا تھے۔ عمر اور عائشہ کو گھر سے نکلتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ دونوں اپنے اپنے کمروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ تین دن سے سکول بھی نہ گئے تھے۔ گھر کے افراد کی پریشانی کے باعث گھر کی تمام اشیاء بھی اداس اور پریشان تھیں۔ عمر کے کمرے کی شیلف میں رکھی کتابیں ڈولی، سونی اور منی بھی پریشان تھیں۔

''ہمیں عمر اور اس کے گھر والوں کو اس پریشانی سے نجات دلانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔'' سونی نے ڈولی کو مخاطب کیا تھا۔

''ہم اس معاملے میں کیا کر سکتی ہیں؟'' ڈولی نے پوچھا۔

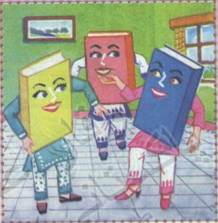

''ہمیں رانی اور روشنی سے رابطہ رکھنا ہوگا، ان کے ذریعے ہم راجو تک پہنچ سکتی ہیں۔'' سونی کی بات ڈولی کے دل کو لگی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

''تم دونوں یہاں رہو اور میں روشنی اور رانی کے ساتھ جگو کے اڈے پر رہوں گی......''

''وہاں تو آپ کی جان کو خطرہ ہو گا۔'' منی نے ڈولی کی بات بھی پوری نہ ہونے دی تھی۔

''ایسے کاموں میں جان کا خطرہ تو ہوتا ہی ہے، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے، میں روشنی اور رانی کے پاس جا رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر ڈولی خاموشی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ رات ہونے والی بارش کے باعث گلیوں اور سڑکوں پر پانی کھڑا تھا۔ ڈولی خود کو پانی سے بچاتی ہوئی جگو کے اڈے تک پہنچنے تک کامیاب ہو چکی تھی۔ روشنی اور رانی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ جب انہیں اس کے آنے کا مقصد معلوم ہوا تو انھوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی ہر ممکن مدد کریں گی۔ ڈولی کو اس بات کی حیرت تھی کہ مجرموں کے اڈے پر روشنی اور رانی کس طرح موجود تھیں۔ ڈولی نے جب اس بارے میں سوال کیا تو رانی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں یہاں لانے والا ریاض ہے۔''

''کون ریاض؟'' ڈولی نے سوال کیا۔

''وہی ریاض جسے آج سب لوگ راجو کے نام سے جانتے ہیں۔''

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' رانی بولی۔

(رانی نے ریاض کے بارے میں ڈولی کو کیا بتایا، یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے)

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

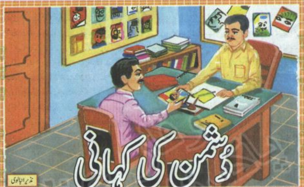

دشمن کی کہانی

نذیر انبالوی

شام کے پانچ بجے جیسے ہی دفتر کا دروازہ بند ہوا ڈوسرے دفتر کا دروازہ کھل گیا تھا۔ تمام دن رسالے کے ایڈیٹر صاحب مختلف لکھنے والوں کی کہانیاں پڑھتے اور قارئین کے فون سنتے رہے تھے۔ اُس وقت اُن کے لیے بولنا اور آپس میں باتیں کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ ایک ڈوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھ تو رہی تھیں، مگر اُن کے لیے آپس میں بات کرنا بے حد مشکل تھا۔ ایڈیٹر صاحب جس کہانی کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈالتے تھے، اُس کہانی کی ہلکی سی چیخ سب کو سنائی دی تھی۔ وہ بے بس کہانی کچھ کر بھی تو نہ سکتی تھی۔ تمام کہانیاں حسرت بھری نظروں سے اپنی بہن کو ردی کی ٹوکری میں دیکھتی تھیں۔ دوپہر کے وقت کھانے اور نماز کے وقفہ میں ایڈیٹر صاحب کمرے سے باہر جاتے تو تمام کہانیاں فوراً ردی کی ٹوکری میں پڑی کہانیوں کی دل جوئی کرنے لگتیں۔ پیر کو جب پانچ بجے دفتر بند ہوا تو ایک کہانی وفا نے ردی کی ٹوکری سے شور مچایا۔

"مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ...... میرا کیا قصور ہے کہ مجھے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا ہے، ایڈیٹر نے مجھے پڑھا بھی نہیں اور میری پیشانی پر دشمن کی کہانی، ناقابل اشاعت لکھ کر فوراً ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا ہے۔" وفا کی آواز سن کر ڈوسری بہت سی کہانیاں اس کے پاس آ گئی تھیں۔

"تمھیں ایڈیٹر نے پڑھا تو تھا، میں اُس وقت وہاں موجود تھی۔" کہانی تلاش نے وفا کو مخاطب کیا۔

"ایڈیٹر نے مجھے صرف ایک نظر دیکھا تھا، پڑھا نہیں، میرے ساتھ ظلم ہوا ہے، میرا موضوع بہترین ہے، مجھے رسالے میں جگہ ملنی چاہیے۔" وفا ردی کی ٹوکری میں پڑی احتجاج کر رہی تھی۔ کہانی دوستی نے آگے بڑھ کر وفا کو پڑھا تو وہ بے اختیار بول اٹھی۔

"بالکل نیا موضوع ہے، نئے خیال کے ساتھ لکھنے کا انداز بھی بہترین ہے، واقعی تمھارے ساتھ ظلم ہوا ہے، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایڈیٹر صاحب نے ایسا کیوں کیا ہے۔"

"ایسا اس لیے ہوا ہے کہ میں ایڈیٹر کے دشمن کی کہانی ہوں۔" وفا بولی۔

"کیا مطلب؟" کہانی الزام بولی۔

"بات یہ ہے کہ مجھے وارث نے لکھا ہے، وارث کی لکھی ہوئی بہت سی کہانیاں بچوں کے رسائل میں شائع ہو رہی ہیں، اس کی کہانیوں کے موضوعات منفرد ہوتے ہیں۔"

"ہمارے ایڈیٹر صاحب کو بھی منفرد موضوعات پر لکھی کہانیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی تلاش ہوتی ہے، مگر پھر تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟'' کہانی برداشت نے وفا کی بات درمیان سے اچک لی تھی۔

''ایسا اس لیے ہے کہ میں ایڈیٹر کے دشمن کی کہانی ہوں، یہ دشمنی اُس وقت شروع ہوئی تھی جب وارث نے ایک انعامی مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ اس مقابلے میں ایڈیٹر نے بھی حصہ لیا تھا۔ ایڈیٹر کو تو کچھ نہ مل سکا البتہ وارث انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔'' وفا کی بات سن کر کہانی تلاش نے کہا۔

''اچھا تو یہ معاملہ ہے، ہم سب تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں، آؤ ردی کی ٹوکری سے باہر آؤ، آ جاؤ، گھبراؤ مت، باہر آ جاؤ۔''

پھر وفا کہانیوں کے کہنے پر ردی کی ٹوکری سے باہر آ گئی۔ کچھ دیر بعد سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ پر واپس چلی گئیں۔ وفا میز پر رکھی فائل میں گھس گئی۔ فائل میں موجود کہانیوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ کہانیوں کی یہ وہ فائل تھی جسے ایڈیٹر صاحب نے صبح آ کر پڑھنا تھا۔

☆

رسالے کا ایڈیٹر منیر ایک ہوٹل میں بیٹھا اپنے دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا۔

''آج وہ میرے دفتر میں اپنی کہانی لے کر آیا تھا جو خود کو اس صدی کا سب سے بڑا ادیب سمجھتا ہے۔''

''میرا خیال ہے تم وارث کی بات کر رہے ہو۔'' کامران نے دہی بڑے کھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے، وارث آیا تھا اپنی کہانی وفا لے کر۔''

''تو کیا تم وہ کہانی شائع کرو گے؟'' بلال نے پوچھا۔

''میں اور وارث کی کہانی شائع کروں یہ کس طرح ہو سکتا ہے، میں نے اُس کی کہانی کو اس کے انجام تک پہنچا دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' یاسر نے منیر کو گھورا۔

''میں نے وارث کی لکھی ہوئی کہانی کو اس مقام تک پہنچایا ہے جس کی وہ حق دار تھی، یعنی ردی کی ٹوکری اس کی منزل تھی اور میں نے اسے اس کی منزل تک پہنچا دیا ہے۔'' منیر نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

دُوسرے دن منیر اپنے دفتر پہنچا تو کہانیوں کی فائل میز پر موجود تھی۔ منیر نے ایک کہانی پڑھی اور اس کی پیشانی پر ''قابلِ اشاعت'' لکھ کر ایک طرف رکھ دیا۔ جب اُس کی نظر وفا کہانی پر پڑی تو وہ اُسے دیکھ کر بڑبڑایا۔

''یہ کہانی اس فائل میں کس طرح آ گئی ہے، اسے تو میں نے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ اسے کس نے فائل میں رکھ دیا ہے۔''

اگلے ہی لمحے اس نے کہانی وفا کو فائل سے نکال کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ کہانیاں تلاش، دوستی، الزام اور برداشت یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ دوپہر کے وقت وارث کا فون آیا۔ اس نے اپنی کہانی کے بارے میں پوچھا تو منیر نے کہا۔

''کہانی مزے دار نہیں ہے، موضوع پرانا ہے۔''

''کیا، موضوع پرانا ہے، کہانی آپ نے پڑھی ہے؟'' وارث کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں...... ہاں...... میں نے کہانی پڑھی ہے، میاں کوشش جاری رکھو تمہاری کوئی نہ کوئی کہانی ضرور قابلِ اشاعت ہو گی۔''

''جی اچھا، میں دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔'' جیسے ہی وارث نے فون بند کیا منیر بڑبڑایا۔

''میرے ہوتے ہوئے تو تمہاری کوئی کہانی میرے رسالے میں نہیں چھپ سکتی۔ ایک بار چھوڑ ہزار بار کوشش کر لو، مگر میں ہر بار تمہاری کوشش کو ناکام بنا دوں گا۔''

ردی کی ٹوکری چونکہ بھر چکی تھی اس لیے اس کو خالی کرنے کے لیے منیر نے خاکروب کو بلایا۔ یوں وارث کی لکھی ہوئی کہانی کوڑے کے ڈھیر پر چلی گئی۔ کوڑے کے ڈھیر پر پڑی کہانی وفا بہت اداس تھی۔ اسے افسوس اس بات کا تھا کہ ایڈیٹر نے اسے پڑھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اگر اس کو پڑھا جاتا تو اس کا مقام کوئی اور ہوتا۔ کوڑے کے ڈھیر پر بدبو ہی بدبو تھی۔

☆

دفتر میں موجود کہانیاں اپنی محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ سب کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہانی وفا کے ساتھ ہونے والے سلوک کا افسوس تھا۔ سب کہانیاں اداس تھیں۔

''وفا کی طرح ہمارے ساتھ بھی ایسا ظلم ہو سکتا ہے۔'' کہانی الزام نے کہا۔

''ایڈیٹر صاحب کے بارے میں رسالے میں چھپی کہانیاں تو کچھ اور ہی بتاتی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہر اچھی کہانی کی وہ قدر کرتے ہیں، اس کو رسالے میں جگہ دیتے ہیں، مگر اب تو معاملہ ہی الٹ ہے۔'' کہانی دوستی بولی۔

''ہم اس الٹ معاملے کو سیدھا بھی کر سکتی ہیں۔'' کہانی برداشت کی بات سن کر محنت کہانی نے پوچھا۔

''وہ کیسے؟''

''وہ اس طرح کہ......'' پھر برداشت نے کہانیوں کو وہ ترکیب بتائی، جس پر عمل کر کے الٹ معاملے کو سیدھا کیا جا سکتا تھا۔

......☆......

منیر کے سامنے بہت سے خطوط پڑے تھے۔ ایک خط پر وارث کا نام اور پتہ لکھا تھا۔ خط دیکھ کر منیر کو غصہ آ گیا تھا۔ اس نے فوراً خط کھولا اور کہانی صبر کو پڑھے بغیر اس پر جلی حروف میں ناقابلِ اشاعت لکھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ کہانی صبر نے احتجاج کیا، شور مچایا، مگر منیر نہ اس کی بات سن رہا تھا اور نہ سمجھ رہا تھا۔ منیر کچھ لکھ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی تھی۔

''کوئی فائدہ نہیں...... کوئی فائدہ نہیں۔''

منیر نے قلم روک کر اِدھر اُدھر دیکھا، مگر اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔ اسی اثناء میں آفس بوائے اختر آ گیا۔ وہ دفتر کی جھاڑ پونچھ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ ہر روز نہایت عمدہ طریقے سے جھاڑ پونچھ کرتا تھا۔ منیر اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھا۔ اس کے کہنے پر اختر کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تھا۔

''اختر! تم نے کچھ سنا ہے۔'' منیر نے اختر سے پوچھا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔''

''یہاں تمہیں کوئی آواز سنائی دی ہے۔''

''میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔'' اختر بولا۔

''اچھا تو پھر وہ میرا وہم ہوگا۔'' منیر نے کہا۔

''آپ کے لیے ٹھنڈا پانی لا دوں۔''

''ہاں...... ہاں...... لے آؤ، آج خاصی گرمی ہے۔''

اختر کے دفتر سے باہر نکلتے ہی پھر آواز گونجی۔

''کوئی فائدہ نہیں...... کوئی فائدہ نہیں۔''

منیر ابھی اس آواز کا کھوج لگا ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔

''میں وارث بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں بولو۔'' منیر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''وہ میں نے کہانی صبر بھیجی تھی......''

''ہاں...... ہاں مل گئی تھی تمہاری کہانی، وہی گھسا پٹا موضوع، میاں کس نے تمہیں کہا ہے کہ کہانیاں لکھو، کوئی اور کام کرو، یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔'' منیر نے وارث کو بات بھی مکمل نہ کرنے دی تھی۔

''آپ نے کہانی غور سے پڑھی تھی۔'' وارث کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ منیر تو آگ بگولا ہو گیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کہانی کا موضوع تو نیا ہے۔''

''یہ تم کہتے ہو، ابھی مطالعہ کرو اور کہانی صبر کے لیے صبر ہی کرو۔''

''جی بہتر، میں صبر کروں گا کیوں کہ صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وارث نے فون بند کر دیا۔

''کوئی فائدہ نہیں...... کوئی فائدہ نہیں۔''

دفتر میں ایک مرتبہ پھر یہ آواز گونجی تھی۔

کہانی وفا کی طرح کہانی صبر بھی کوڑے کے بدبودار ماحول میں پہنچ گئی تھی۔

وارث کب ہار ماننے والا تھا۔ چند دنوں بعد اس نے اپنی نئی کہانی مہلت ارسال کی۔ منیر نے ہمیشہ کی طرح بغیر پڑھے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہانی کو بھی ردی کی ٹوکری کا راستہ دکھا دیا۔ وارث نے کہانیاں بھیجنا تو بند نہ کیں البتہ اس نے فون کر کے کہانیوں کے بارے میں پوچھنا بند کر دیا تھا۔ منیر جب بھی وارث کی کہانی کو ردی کی ٹوکری میں ڈالتا دفتر میں ''کوئی فائدہ نہیں۔'' کا جملہ سنائی دیتا۔

ایک دن منیر کام میں مصروف تھا کہ اختر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح ایک کپڑا تھا۔ اس نے آتے ہی جھاڑ پونچھ کرنا شروع کر دی۔ وہ ایک ایک چیز کو اٹھا کر صاف کر رہا تھا۔ منیر نے اپنے دفتر میں آج تک گرد و غبار سے اٹی کوئی چیز نہ دیکھی تھی۔ اختر نہایت ایمان داری اور محنت سے اپنا کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس دفتر کے دیگر ملازمین اپنے کام میں لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ منیر یہی سمجھتا تھا کہ اختر ایسا مالک کے خوف کے باعث کرتا تھا، مگر جب منیر نے اس سے بات کی تو وہ بولا۔

''مجھے گرد و غبار سے نفرت ہے۔ یہ چیزوں پر پڑے تو انہیں خراب کرتا ہے اور اگر دل پر جم جائے تو دل سے نرمی اور پیار رخصت ہو جاتا ہے۔''

اختر نے بڑی گہری بات کہی تھی۔ وہ تو دفتر کی چیزوں اور اپنے دل سے گرد و غبار صاف کر کے چلا گیا، مگر منیر کو سوچوں کے سپرد کر گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اِرد گرد اور اس کے دل پر گرد و غبار جم گیا ہو۔ اس نے اس گرد و غبار کو صاف کرنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اسی لمحے وارث کی ساری کہانیاں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی تھیں۔

''میں کہانی وفا ہوں، میرا نام کہانی صبر ہے، مجھے مہلت کہانی کہتے ہیں، ہماری پیشانیوں پر دشمن کی کہانی، ناقابلِ اشاعت لکھا ہے۔'' کہانیوں کی یہ آوازیں سن کر منیر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے گرد و غبار کا طوفان اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس کے اِرد گرد گرد و غبار ہی گرد و غبار تھا۔ اس کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں ''کوئی فائدہ نہیں، کوئی فائدہ نہیں۔'' کا جملہ سنائی دیا۔ منیر اب کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے موبائل فون پر وارث کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد وہ وارث سے بات کر رہا تھا۔

''میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ نے اس لیے فون کیا ہے کہ میری کہانی قابلِ اشاعت نہیں، میں ہمت نہیں ہاروں گا، میں پھر کوشش کروں گا۔''

''ایسی بات نہیں ہے، کیا آپ کے پاس کہانیاں وفا، صبر اور مہلت کی فوٹو کاپیاں محفوظ ہیں۔''

''جی...... جی ہاں...... میرے پاس ان کہانیوں کی فوٹو کاپیاں موجود ہیں، مگر آپ تو ان کہانیوں کو پڑھ کر ناقابلِ اشاعت قرار دے چکے ہیں۔''

''میں نے ان کہانیوں کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ میں آپ کو اپنا ادبی دشمن سمجھنے لگا تھا۔ آپ کی کامیابیوں سے میں حسد میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اختر کی بات نے میرے دل پر پڑے گرد و غبار کو صاف کر دیا ہے۔''

''کون اختر؟'' وارث نے سوال کیا۔

اس کے جواب میں جب منیر نے ساری بات بتائی تو وارث نے کہا۔

''اختر نے درست کہا ہے کہ دل پر حسد اور نفرت کی گرد و غبار جم جائے تو پھر دل سے نرمی اور پیار رخصت ہو جاتا ہے۔''

وارث کو فون کر کے منیر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دفتر میں موجود سبھی کہانیوں نے وارث اور منیر کی گفتگو سنی تھی۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔

''فائدہ تو اب ہو گا، جو لکھنے والا اپنی لکھی ہوئی باتوں پر خود عمل نہ کرے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، فائدہ تو تب ہوتا ہے جب وہ ان باتوں پر خود عمل کرے جن سے وہ دوسروں کو روکتا ہے۔''

اب اس راز سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا کہ ''کوئی فائدہ نہیں۔'' کی آواز کس کی تھی۔ شام کو جب وارث اپنی کہانی لایا تو منیر نے اُسے پڑھ کر اُس پر ''دشمن کی کہانی'' کی بجائے ''دوست کی کہانی'' لکھ کر قابلِ اشاعت کہانیوں کی فائل میں رکھ لیا۔ اُس کے ایسا کرنے کی دیر تھی کہ دل پر جمی گرد و غبار ایک جھٹکے سے ختم ہو گئی تھی۔ اب اُس کے صاف ستھرے دل میں نرمی بھی تھی اور پیار بھی تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہونہار مصور

میری گڑیا، پیاری گڑیا!

زوہیب شہزاد، گوٹھ ماچھی (پہلا انعام 175 روپے کی کتب)

عائشہ ادریسی، علی پور (دوسرا انعام 150 روپے کی کتب)

عائشہ منور، اسلام آباد (تیسرا انعام 125 روپے کی کتب)

تسمیہ ادریس کھتری، کراچی (چوتھا انعام 100 روپے کی کتب)

ثناء جمال، اسلام آباد (پانچواں انعام 90 روپے کی کتب)

شہزادہ صغیر، جھنگ (چھٹا انعام 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: شاہ تاج اکبر، بہاول پور۔ سید محمد عمیر، پشاور۔ فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ سارہ طارق، فیصل آباد۔ عمر عباس، گجرات۔ جویریہ کرن، چوآسیدن شاہ۔ حمنہ نوید، لاہور۔ ذکیہ طارق، سوہاوہ۔ آئشہ مرتضیٰ، گوجرانوالہ۔ اقصیٰ رحمان، بھمبر۔ عبداللہ ایوب، جہلم۔ اقراء محمود، بورے والا۔ محمد عثمان علی شیخ، ماہا زینب گیلانی، لاہور۔ صدیقہ ناز، نوشہرہ۔ ایم افضل، بورے والا۔ محمد باسط خان، میاں والی۔ محمد یوسف عباسی، پشاور۔ آمنہ سراج، اسلام آباد۔ بدر سعید، لاہور۔ سید اویس حبیب، چارسدہ۔ ماہا مائیکل ساہی وال۔ خدیجہ اسماعیل، زنیرہ اسماعیل، گوجرانوالہ۔ مدیحہ اسلم، کراچی۔ اقصیٰ نورین، گجرات۔ محمد علی، تونسہ۔ ماہ نور، راول پنڈی۔ سید رضا، لاہور۔ نور فاطمہ، ملتان۔ محمد ظفر حسنین، کوئٹہ۔ اختر شاہ، اسلام آباد۔ راحت سلیم، لاہور۔ اشرف علی، ملتان۔ نور رضا، کاموکی۔ عمیر احمد، سرگودھا۔ رضوان اسلم، خوشاب۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

نومبر کا موضوع "میرا پیارا تعلیم و تربیت"

آخری تاریخ 8 اکتوبر

دسمبر کا موضوع قائداعظم

آخری تاریخ 8 نومبر

WWW.PAKSOCIETY.COM

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 اکتوبر 2012ء ہے۔

ستمبر 2012ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- اب پتہ چلا ہے کہ دن ویلنگ تو بندروں کا کام ہے۔ (زرینہ عثمان، فیصل آباد)
- بندر ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے۔ (شافیہ ریحان، لاہور)
- بندر میاں متوالے، کام ہیں ان کے نرالے۔ (زرمین کنول، ملتان)
- بندر جی! کیا مجھے لفٹ مل سکتی ہے؟ (محمد وحید، راول پنڈی)
- بندر نے بھی انسانوں جیسی حرکتیں کرنا سیکھ لی ہیں۔ (ماہین الماس، فیصل آباد)

WWW.PAKSOCIETY.COM